جاسوسی کہانیاں
ایک لڑکے کے جاسوسی کارنامے
11
10
9
8
7
4
5
60
45
15
30
فیروز سنز لمیٹڈ

جاسوسی کہانیاں

ایک لڑکے کے جاسوسی کارنامے

امان اللہ

فہرست

پڑھنے سے پہلے

تم نے بہادری، جرأت اور ہنسی مذاق کی کہانیاں تو بہُت پڑھی ہوں گی۔ مگر جاسُوسی کہانیاں اب تک شاید ہی تمہاری نظر سے گُزری ہوں۔ اُردو میں بچّوں کے لیے ایسی کہانیاں لکھی ہی نہیں گئیں۔ بچّوں کی کتابوں میں تمہیں ایک کتاب بھی جاسُوسی کے متعلّق نہ ملے گی۔

جاسُوسی اور سُراغ رسانی کی کہانیاں سب کہانیوں سے الگ تھلگ اور عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ ان میں ایسے اُلجھے ہوئے، پیچیدہ اور انوکھے واقعات ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا قدم قدم پر اُچھل پڑتا ہے اور ہر لفظ پر اُس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ یہ کیا تھا؟ یہ کیا ہوا؟ اب کیا ہو گا؟ ایسے سوال پڑھتے وقت اُس کے دماغ میں گھومتے رہتے ہیں اور وُہ کہانی کی دلچسپی کی بھُول بھلیّوں میں ایسا کھو جاتا ہے کہ کہانی ختم کیے بغیر کتاب نہیں چھوڑتا۔

اس کتابی میں ساری کہانیاں جاسُوسی ہیں۔ کہانیوں کا ہیرو ایک ۱۴ سالہ لڑکا ظہیر

میرے جو اپنی ہوشیاری، چالاکی اور عقل مندی سے اُلجھی ہوئی باتیں ایسی خُوبی سے سُلجھاتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ ظہیر کی سارے شہر میں دھوم مچ جاتی ہے اور اخبار اس کی تصویر فخر سے چھاپتے ہیں۔ جہاں ظہیر کی عقل مندی اور ذہانت پر تعجّب کروگے، وہاں تمھیں اس کا دوست شوکت اپنی چٹپٹی اور مزاحیہ باتوں سے ہنساتے ہنساتے لوٹ پوٹ کر دے گا اور تم بے اختیار قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔

کتاب میں نو کہانیاں شامل ہیں۔۔۔۔ ہر کہانی حیرت، تعجّب اور عجیب و غریب واقعوں میں اُلجھی ہوئی ہے۔ زبان بڑی میٹھی، صاف سُتھری اور سیدھی سادی ہے۔ اُمید ہے کہ مزے لے لے کر پڑھو گے۔ اگر تُم نے یہ کہانیاں پسند کیں تو ہم ان ہی جیسی اور کہانیاں بھی چھاپیں گے جو دلچسپی کے لحاظ سے ان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوں گی۔

ننّھا جاسُوس

ظہیر اپنے باپ کی اُمّیدوں کے بالکل خلاف تھا۔ اس کے باپ کپتان رشید چاہتے تھے کہ وُہ بھی اُن کی طرح ورزشی کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے اور جس طرح اُن کی ہاکی اور فٹ بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے مُلک کے کونے کونے میں شہرت ہے، اسی طرح اُن کے بیٹے کی بھی دھوم مچے۔ مگر ظہیر کو کھیل کود سے خُدا واسطے کا بیر تھا۔ وُہ اپنے ہم جماعتوں کو کرکٹ یا فٹ بال کھیلتا ہوا دیکھتا تو نفرت سے مُنہ پھیر لیتا۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ سُست مزاج یا ڈرپوک تھا اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ نہیں۔ بلکہ اُسے ایک اور ہی چسکا پڑا ہوا تھا اور وہ تھا جاسُوسی کا چسکا۔

ظہیر نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اور اُسے پڑھنے لکھنے میں شُدبُد ہوئی تھی، وُہ جاسُوسی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اُس کے جیب خرچ کے زیادہ تر پیسے جاسُوسی کہانیوں کی کتابیں خریدنے میں ہی صرف ہوتے۔ اسکول سے آکر اس

کے دوسرے ساتھی تو گیند بلّا لے کر کسی میدان کا رُخ کرتے اور وہ اس وقت جاسُوسی کی کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور اُس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا جب تک کپتان صاحب باہر آکر اُسے بُرا بھلا کہنا نہ شروع کر دیتے۔

جاسُوسی سے دِل چسپی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے جاسُوس بننے کے خواب دیکھا کرتا اور ہر وقت اس کے دماغ میں یہی باتیں گھُوما کرتیں۔ چنانچہ اس وقت بھی جب کہ وہ نائی کی دُکان پر بیٹھا حجامت بنوا رہا تھا، اس کا خیال ایک جاسُوسی کہانی کے ہیرو پر لگا ہوا تھا جس نے ایک سال کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک چور کا سراغ لگا لیا تھا اور پھر چور بھی کیسا؟ شہر کا ایک نامی گرامی سوداگر جس کے متعلّق کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتا ہے۔

اِن خیالات میں وُہ ایسا کھویا کہ اُس کا سر بے خبری میں بائیں طرف کو جھک گیا۔ نائی نے جھلّا کر قینچی روک لی اور مُنہ بگاڑ کر بولا :

”صاحب! سر سیدھا رکھیے۔ آپ بار بار اِدھر اُدھر کر لیتے ہیں۔“

ظہیر نے چونک کر سر سیدھا کر دیا اور سامنے لگے ہوئے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ نائی کی قینچی تیزی سے چل رہی تھی۔ مگر ظہیر کا خیال پھر کسی جاسوسی کہانی میں اُلجھ گیا تھا کہ دُکان کا دروازہ زور سے کھُلا اور ایک ہانپتا ہُوا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ ٹپک رہی تھی اور پھُولی ہوئی سانس سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہُت دُور سے چل کر آیا ہے۔ دوسرا نائی جلدی سے اُس کے پاس پہنچا اور ادب سے بولا۔ ''فرمایئے صاحب!''

آنے والے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ''جلدی کرو۔ میری داڑھی مونچھیں صاف کر دو۔''

اور جب نائی اس کی گھنی ڈاڑھی کو صابن لگا کر اُسترا چلانے لگا تو ظہیر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس شخص کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ جُوں جُوں وُہ اس کے متعلّق سوچتا، اُس کی دلچسپی بڑھتی جاتی۔ یہ شخص اِتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے اور اپنی ڈاڑھی کیوں صاف کرا رہا ہے؟ کہیں یہ چور یا ڈاکو تو نہیں جو پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنا حُلیہ بدل رہا ہے۔ ظہیر کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ اس وقت وُہ اپنے

آپ کو خفیہ پولیس کا انسپکٹر سمجھ رہا تھا اور اس شخص کو گھُور گھُور کر دیکھ رہا تھا جیسے کوئی جاسُوس کسی مُجرم کو دیکھتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد نائی نے ظہیر کی گردن سے کپڑا کھول لیا اور بُرش سے بال صاف کرتے ہوئے بولا۔ "لیجیے صاحب! دیکھ لیجیے۔ ٹھیک ہے نا؟"

ظہیر نے جیب سے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیے اور سلام کر کے باہر نِکل آیا۔ وُہ لاکھ اپنے خیال کو اس آدمی کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ مگر ہر پھِر کر اسی عجیب و غریب شخص کی صُورت اس کی آنکھوں تلے پھِرنے لگی۔ آخر یہ کون ہے؟ اور۔۔۔ اور۔۔۔۔

"اونھ ہو گا کوئی۔" اس نے اپنے دِل کو سمجھایا اور ایک طرف کو چلنے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ قدم خُود بخُود رُک گئے اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ دُکان والا اجنبی باہر نِکل رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بالکل صاف تھا۔ اُس نے باہِر نِکل کر پہلے اِدھر دیکھا اور پھِر دائیں طرف کو چلنے لگا۔ ظہیر کو اُس پر شُبہ تو دُکان میں ہی ہو چُکا تھا۔ اب اُسے سٹ پٹایا ہوا دیکھ کر اس کا شبہ یقین میں بدل گیا اور اُس نے پکّا

اِرادہ کرلیا کہ اس آدمی کا پیچھا کروں گا۔ دیکھوں تو کون ہے اور کہاں جاتا ہے۔

اجنبی اتنا تیز چل رہا تھا کہ ظہیر کو بعض وقت اُس کے پیچھے دڑنا پڑتا۔ آخر دس منٹ کی دوڑ دھوپ کے بعد وُہ کھُلے بازار کو چھوڑ کر ایک تنگ گلی میں گھُس گیا جو بالکل سُنسان تھی۔ اس نے ایک دفعہ پلٹ کر دیکھا اور ظہیر کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر ایک جگہ رُک کر جُوتے جھاڑنے لگا۔ اُسے رُکتا دیکھ کر ظہیر بھی رُک گیا۔ مگر یہ اُس نے غلطی کی۔۔۔ اجنبی فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکا اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وُہ کُچھ دیر کڑی نظروں سے ظہیر کو دیکھتا رہا اور پھر جلدی سے بائیں طرف والی گلی میں مُڑ گیا۔ ظہیر بھی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا گلی میں پہنچا اور حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کیوں کہ گلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ اُس نے دو چار مکانوں کے دروازوں میں تاکا جھانکا لیکن بے کار۔ اجنبی اُس کے دیکھتے دیکھتے چھلّاوے کی طرح غائب ہو چُکا تھا۔ وہ حیرت سے کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ الٰہی! یہ کیا معاملہ ہے کہ پیچھے سے اُس کے کاندھے پر کسی نے زور سے ہاتھ رکھا۔ ظہیر نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کے مُنہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ وہی اجنبی تھا جس کا وہ پیچھا کر رہا تھا۔ اُس کی

آنکھوں میں فتح مندی جھلک رہی تھی اور ہونٹوں پر اس طرح کی پھیکی پھیکی مُسکراہٹ تھی جیسے وُہ ظہیر کا مذاق اُڑا رہا ہو۔

"کیوں میاں برخوردار!" اجنبی مُسکرا کر بولا۔ "تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟ تُم مُجھے کوئی شریف زادے دکھائی دیتے ہو۔ اس لیے میں تُمہیں کُچھ نہیں کہتا۔ لیکن اب اگر تم میرے پیچھے آئے تو یاد رکھو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا اور ظہیر کھڑا سوچتا ہی رہ گیا کہ کرے تو کیا کرے۔

اجنبی نے ظہیر سے پیچھا چھُڑا کر اِطمینان کی ایک گہری سانس لی اور جلدی جلدی گلی پار کر کے بڑی سڑک پر چلنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ ظہیر اس کے ڈرانے دھمکانے سے اب اُس کے پیچھے نہیں آئے گا۔ مگر کیا اُس کا یہ خیال صحیح تھا؟ نہیں! دُھن کا پکّا ظہیر برابر اُس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ سڑک پر لوگوں کا ہجوم بہت تھا۔ اس لیے جب اجنبی رُک کر پیچھے کی طرف دیکھتا تو وُہ جلدی سے دوسرے لوگوں کی آڑ میں ہو جاتا اور جب اجنبی چلنے لگتا تو وہ بھی اُس کے پیچھے ہو

لیتا۔

آدھ گھنٹے لگاتار چلنے کے بعد اجنبی ایک عالی شان مکان کے پاس جا کر رُکا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ یہ وقت ظہیر کے لیے بڑا نازک تھا۔ وُہ چُپ چاپ، دبے پاؤں، سانس روکے مکان کی پچھلی طرف گیا اور ایک کھڑکی کے راستے اندر گھُسنا ہی چاہتا تھا کہ اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اجنبی کمرے کے اندر ایک میز پر جھُکا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے آگے بے شمار کاغذ بکھرے پڑے تھے اور ایسا معلُوم ہوتا تھا جیسے وُہ کوئی خاص کاغذ یا خط تلاش کر رہا ہے۔ مگر ایں! یہ کیا؟ یکایک کمرہ کا دروازہ کھلا اور ایک موٹا سا شخص ہاتھ میں پستول لیے اندر داخل ہوا۔

"خبردار!" آنے والا پستول تان کر گرجا۔ "اگر اپنی جگہ سے ہلا تو گولی مار دوں گا۔"

اجنبی اس ناگہانی مُصیبت کو دیکھ کر گھبرا گیا اور بچاؤ کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پستول والے شخص نے اجنبی کی صُورت غور سے دیکھی اور چونک کر بولا۔
"اخّاہ! غیّاث صاحب! آپ ہیں؟ وُہ آپ کی ڈاڑھی کہاں گئی؟ ہاہاہا! تُم سمجھتے ہو کہ تمہارا صفا چٹ چہرہ دیکھ کر میں تمہیں پہچان نہ سکوں گا۔ مگر یہ تمہاری بھُول ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ تُم میرے قبضے سے نِکل کر کیسے جاتے ہو۔"

ظہیر کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر اجنبی کے ہاتھ پر پڑی جو آہستہ آہستہ جیب کی طرف جا رہا تھا۔ ظہیر فوراً اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ اجنبی جیب سے پستول نکال سکے، اُس نے ایک بڑی اینٹ اُٹھا کر زور سے اُس کی طرف پھینکی۔ مگر گھبراہٹ میں نشانہ چُوک گیا اور اینٹ

اجنبی کو لگنے کی بجائے پستول والے شخص کو جا لگی۔ آب اجنبی کی باری تھی۔ اُس نے بڑی پھرُتی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور کھڑکی کی طرف مُنہ کر کے بولا۔ ”شاباش میاں! تُم بُہت بہادُر ہو۔ تُم نے میری جان بچا لی۔ اندر آ جاؤ۔“

ظہیر کمرے کے اندر کُود گیا اور بولا۔ ”مگر میں۔۔۔ میں نے تو آپ کو نشانہ بنایا تھا۔ اینٹ غلطی سے انہیں لگ گئ۔ میں پولیس کو بُلانے جا رہا ہوں۔۔۔۔“

اجنبی مُسکرا کر بولا۔ ”پولیس کو بُلانے کی ضرورت نہیں۔ میرا نام غیاث ہے اور میں خُفیہ پولیس کا انسپکٹر ہوں۔ یہ شخص جو تمہارے سامنے کھڑا ہے، بڑا خطرناک ڈاکو ہے۔ ایک مہینہ ہوا کہ کراچی سے ایک بہت بڑے سیٹھ کو لُوٹ کر لاہور آ گیا تھا۔ خُدا کا شکر ہے کہ آج میں اِسے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔“

دُوسرے دِن اخباروں نے اس واقعے کو بڑی بڑی سُرخیوں کے ساتھ چھاپا:

”کراچی کا مشہور ڈاکو گرفتار کر لیا گیا۔ خفیہ پولیس کے انسپکٹر غیّاث نے ڈاکو کے قبضے سے لاکھوں روپے کا چوری کا مال بر آمد کر لیا۔ ڈاکو کی گرفتاری کپتان رشید

کے لڑکے ظہیر کی مدد سے عمل میں آئی۔۔۔"

کپتان رشید خوشی سے پُھولے نہ سماتے تھے اور خوش بھی کیسے نہ ہوتے۔ سارے شہر میں اُن کے بیٹے کا چرچا تھا۔ ظہیر اُن کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اُس کی پیٹھ ٹھونک کر بولے۔ "شاباش میرے بیٹے! واقعی تم بڑے ہو کر ایک جاسُوس بنو گے۔"

گھڑی چور

شہر میں نمائش لگی ہوئی تھی۔ قسم قسم کی دُکانوں کے علاوہ سینما، تھیٹر، سرکس اور کرتب والے بھی آئے ہوئے تھے۔ سارا شہر نمائش پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ جِدھر دیکھو تماش بینوں کی ریل پیل۔ جہاں دیکھو لوگوں کا اژدھام۔ نمائش کے شروع ہوتے ہی داہنے ہاتھ کو ایک چھوٹا سا خیمہ لگا ہوا تھا جس کے دروازے پر موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ ”ملک کے مشہور نجومی شیخ عطائی جو اپنے علم کے ذریعے حاجت مندوں کی حاجت، دکھیوں کا دُکھ اور مُصیبت زدوں کی مُصیبت دُور کرتے ہیں۔ کھوئی ہوئی چیزوں کا پتا بھی بتاتے ہیں۔ آیئے اور فائدہ اُٹھایئے۔ فیس صرف ۸۔“ خیمے کے اندر ایک سفید ڈاڑھی مونچھ کے بزرگ لمبا سا چُغّہ پہنے سر پر رومال باندھے اور گلے میں تسبیحوں کا ہار ڈالے بیٹھے تھے اور ان کے پاس ایک لڑکا بیٹھا جھُوم رہا تھا۔ جھُومتے جھُومتے لڑکے نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جمائی لے کر بولا۔ ”ہت تیری کی! ابھی تک تو کوئی کم بخت ٹپکا نہیں۔ جھُومتے

جھُومتے میرا تو سر چکرانے لگا۔"

بزرگ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور ڈاڑھی سہلا کر بولے: "صبر کرو۔ کوئی نہ کوئی تو ضرور ہی آئے گا۔ اُونھ! اس کم بخت ڈاڑھی نے تو میرے گالوں کو چھیل ڈالا۔ جب کوئی آئے گا تو پھر لگا لوں گا۔" یہ کہہ کے اُس نے ڈاڑھی مونچھیں اُتار کر ایک طرف رکھ دیں۔

دوسرا لڑکا اُس کی صورت دیکھ کر ہنس پڑا اور بولا۔ "یار ظہیر! ڈاڑھی مونچھیں لگا کر بولا۔ "ڈاڑھی لگا کر تو تُم سچ مُچ ولی اللہ معلُوم ہوتے ہو۔ سُنو! شاید کوئی آ رہا ہے۔"

ظہیر نے اُٹھ کر باہر جھانکا اور سر ہلا کر بولا: "ابھی تو صُبح ہی ہے۔ ابھی کون آئے گا۔" یہ کہہ کر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

شہر میں نمائش کی خبر سُن کر ظہیر کو بیٹھے بیٹھے مستی جو سوجھی تو وہ شوکت سے کہنے لگا۔ "یار شوکت! کوئی ایسی ترکیب سوچنی چاہیے جس سے سارے دوستوں کو بے وقوف بنایا جا سکے اور وہ ہماری شرارت کا لوہا مان جائیں۔"

دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ آخر کار یہ تجویز پاس ہوتی کہ ظہیر تو بنے نجومی اور شوکت اُس کا چیلا اور دونوں نمائش میں خیمہ لگا کر بیٹھ جائیں۔ جب سکول کے لڑکے اُن کے پاس آئیں گے تو وُہ اُنہیں خُوب اُلّو بنائیں گے۔

نمائش لگے دُوسرا دِن تھا۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ مگر ابھی تک ان کے پاس ایک آدمی بھی نہ آیا تھا۔ شوکت بد دِلی سے بولا۔ ”معلوم ہوتا ہے یہاں کے لوگوں کو نجومیوں کی ضرورت نہیں۔ عجب بد ذوق انسان ہیں۔“

ظہیر جواب میں کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ باہر سے کسی نے پکار کر کہا۔ ”جناب! میں اندر آسکتا ہوں؟“

شوکت جلدی سے پردے کے پیچھے چھُپ گیا اور ظہیر داڑھی لگا کر بھاری آواز میں بولا: ”آجاؤ بیٹا!“

پکارنے والا خیمے کے اندر آگیا اور ظہیر نے اُس کی صورت دیکھی تو اُچھلتے اُچھلتے بچا۔ یہ اس کا ہم جماعت رشید تھا جس سے اس کی اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ربڑ کی ایک چھوٹی سی گیند تھی جسے وہ بے قراری سے مسل رہا تھا۔ ظہیر

نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر درویشوں کی طرح آنکھیں بند کر کے بولا۔
”ہُوں! ہم خوب جانتے ہیں تُم کیوں آئے ہو۔ فکر نہ کرو۔ ہم تمہاری ہر طرح سے مدد کریں گے۔“

رشید گڑ گڑا کر بولا۔ ”شکریہ جناب! دراصل میں اس وقت سخت پریشان ہوں۔ میری گھڑی کہیں کھو گئی ہے۔ کیا آپ مجُھے اس کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ “

ظہیر ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا اُٹھا اور میز پر ایک ہانڈی رکھ کر اس میں جھانک کر

بولا: ”گھڑی کیسی تھی؟ جیبی؟“

”جی ہاں! جیبی ہی تھی۔“ رشید نے جواب دیا۔ ”اس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا اور چاندی کی زنجیر بھی تھی۔ یہ گھڑی میرے والد نے چار سو روپے میں خریدی تھی۔ میری شامت آئی تو میں جیب میں ڈال کر نمائش میں آ گیا۔ ہائے کیا کروں۔ والد صاحب کو خبر ہو گئی تو آفت آ جائے گی۔ خدا کے لیے آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ میں آپ کو دوگنی فیس دُوں گا۔“

ظہیر ہاتھ اُٹھا کر زور سے بولا۔ ”ٹھہرو! ہم ابھی بتاتے ہیں۔“

اُس نے پانچ منٹ تک ہانڈی کے اندر کسی چیز کو دیکھا اور پھر خوش ہو کر بولا۔

”ٹھیک! بالکل ٹھیک! اچھا بچہ اب تم جاؤ۔ سہ پہر کو ہمارے پاس آنا۔ خُدا نے چاہا تو تمہاری گھڑی تمہیں مل جائے گی۔“ رشید سلام کر کے چلا گیا۔

شوکت نے باہر نکل کے زور کا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”دیکھا اس رشید کے بچّے کو۔ اسکول میں کیا بنتا ہے اور اب مُصیبت کے وقت کیسا گڑ گڑا رہا ہے۔“

ظہیر بالوں میں انگلیاں پھیر کر بولا۔ ”ہاں! یہ تو ہے۔ مگر اب ہمیں اس گھڑی کا کھوج لگانا ہے۔ ورنہ بے چارے پر وہ مار پڑے گی کہ چمڑی تک اُدھڑ جائے گی۔ سُنا ہے باپ بڑا ظالم ہے اس کا۔“

شوکت بے پروائی سے بولا۔ ”چھوڑو بھی۔ کہاں ڈھونڈتے پھرو گے؟ سہہ پہر کو آئے تو تھوڑا سا بے وقوف بنا دینا۔“

ظہیر اُٹھ کر بولا۔ ”نہیں! مرتے کو مارنا اچھا نہیں۔ واقعی وہ اس وقت مُصیبت زدہ ہے اور بحیثیت ایک ہم جماعت کے ہم پر فرض ہے کہ ہم اس کی مدد کریں۔ چلو ذرا نمائش کا ایک چکّر لگا آئیں۔“

اُس نے چُغّہ وغیرہ اُتار کر سادے کپڑے پہن لیے اور شوکت کے ساتھ نمائش میں ٹہلنے لگا۔

ظہیر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ رشید کی گھڑی کہاں تلاش کرے۔ اس نے وعدہ کرنے کو تو کر لیا مگر اب جو سوچا تو بڑی مشکل نظر آئی۔ پھر بھی اس نے ہمّت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اِدھر اُدھر لوگوں کو بھانپنے لگا۔ یونہی! ممکن ہے کوئی

ایسا کھوج نکل جائے جس سے گُم شدہ گھڑی کا سُراغ مل سکے۔ ایک طرف ایک بڑی سی میز کے گرد بہت سے لڑکے جمع تھے۔ میز پر ایک صندوق تِرچھا رکھا ہوا تھا جس میں کئی خانے تھے۔ لڑکے باری باری خانوں میں گیند پھینک رہے تھے۔ جو لڑکا جیت جاتا، کھیل کا مینجر اُسے ایک گیند دے دیتا۔ بالکل ویسی گیند جیسی رشید کے پاس تھی۔

ظہیر شوکت کا ہاتھ پکڑے دلچسپی سے کھیل دیکھنے لگا۔ ایک لڑکا گیند پھینک رہا تھا۔ اُس نے نشانہ باندھ کر گیند پھینکی اور گیند غن سے خانے میں جا گری۔ مینجر خُوش ہو کر بولا۔ ”واہ! میاں صاحب زادے کیا نشانہ ہے۔ لو یہ تمہارا انعام۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک گیند اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ لڑکا گیند لے کر چلا گیا تو مینجر ظہیر سے بولا۔ ”آؤ میاں! تم بھی قسمت آزما دیکھو۔ چار پیسے میں آٹھ آنے کی گیند لے جاؤ۔“

ظہیر مسکرا کر بولا۔ ”اتنے فاصلے سے خانے میں گیند ڈالنا بڑا مشکل کام ہے۔“

مینجر نے کہا۔ ”یہ بات تو ہے میاں! پھر بھی قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے؟ صبح

سے یہ تیسرا لڑکا ہے جس نے انعام جیتا ہے۔" ظہیر بولا۔ "ابھی ابھی میرا ایک دوست انعام جیت کر گیا ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو گا۔ گوری رنگت، بھُوری آنکھیں، نیلا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔"

مینجر سوچ کر بولا۔ "ہاں ہاں! ماشاء اللہ! بہت مشّاق نشانہ باز ہے۔ اس نے آتے ہی کوٹ تو ایک طرف اُتار کر رکھ دیا اور ایسی تاک کر گیند پھینکی کہ وہ جِیت کے خانے میں جا کر گری۔"

ظہیر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولا۔ "آپ کو یاد ہے اس نے اپنا کوٹ کہاں رکھا تھا؟"

یہ کہہ کر اُس نے کنکھیوں سے اپنی داہنی طرف والے لڑکے کو جو آہستہ آہستہ پیچھے کو کھِسک رہا تھا، دیکھا۔ مینجر حیرانی سے اس کا مُنہ تکنے لگا اور سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "اتنا تو مُجھے یاد ہے کہ اُس نے کوٹ اُتارا تھا مگر یاد نہیں کہ کہاں رکھا تھا۔ مگر کیوں! بات کیا ہے؟"

ظہیر جلدی سے بولا۔ "یونہی پوچھ رہا تھا۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ معاف کیجیے

گا۔"

بھیڑ کو چیر تا پھاڑ تا ظہیر باہر نکل آیا۔ کُچھ فاصلے پر وہی لڑکا جا رہا تھا جو اُس کی داہنی طرف کھڑا اینگا اور پھر ایک دم کھسک آیا تھا۔

ظہیر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے بولا۔ "شوکت جلدی کرو۔ ہمیں ان صاحب زادے کو پکڑنا ہے۔"

لڑکا تیزی سے ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ ظہیر نے بھی رفتار تیز کر دی اور جلد ہی اُسے جا لیا۔ لڑکا اپنے پیچھے انہیں آتا دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹکا۔ مگر پھر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ظہیر نے جان بوجھ کر زور سے اس کے کاندھے سے کاندھا مارا اور بناوٹی گھبراہٹ سے بولا۔ "ارے معاف فرمایئے۔ دراصل مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ دو بجے مجھے گھر پہنچنا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اِس وقت کتنے بجے ہوں گے؟"

لڑکا سٹپٹا کر بولا۔ "م۔ معلوم نہیں۔ میرے پاس گھڑی نہیں۔"

ظہیر نے اس کی جیب کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر بولا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔ یہ لٹکتی ہوئی زنجیر صاف بتا رہی ہے کہ آپ کی جیب میں گھڑی ہے اور آپ فرما رہے ہیں کہ میرے پاس گھڑی نہیں۔"

اتنا کہہ کر اُس نے جھٹ اس کی جیب سے گھڑی نکال لی۔ لڑکے کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ گھبرا کر بولا۔ "یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ گھ۔ گھڑی۔ یاں۔ ہے تو۔۔۔ م۔۔ میں۔"

شوکت اُچھل کر بولا۔ "ایں؟ سونے کا پانی۔ چاندی کی زنجیر؟ جیبی گھڑی۔۔۔؟ اررررررر۔" ظہیر ڈانٹ کر بولا۔ "بتاؤ یہ گھڑی تم نے میری جیب سے کیوں نکالی؟ پولیس! پولیس!"

لڑکا خوف سے کانپ رہا تھا۔ مری ہوئی آواز میں بولا۔ "خدا کے لیے میری بات تو سُنیے۔ میں نے چُرائی نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں مجھے پڑی ملی تھی۔ اگر آپ کی ہے تو آپ لے لیجیے۔"

ظہیر بولا۔ "اچھّا جاؤ۔ میں معاف کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔"

لڑکا چلا گیا تو شوکت حیرت سے بولا۔

"ارے ظہیر! تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کے پاس رشید کی گھڑی ہے۔"

ظہیر قہقہہ لگا کر بولا۔ "میرے دوست! جاسوسوں کی باتیں ہیں۔ تم کیا جانو۔ ایسی باتوں میں 'اتّفاق' بہت چلتا ہے۔ تم نے دیکھا تھا جب میں گیند والے سے باتیں کر رہا تھا تو یہ لڑکا میری دائیں جانب کھڑا تھا۔ جب میں نے رشید کے کوٹ کا ذکر کیا تو یہ جلدی سے باہر نکل آیا۔ اس سے مجھے شُبہ ہو گیا اور میں نے اس کا پیچھا کرنے کی ٹھانی۔ بے چارا گھبراہٹ میں گھڑی کی زنجیر جیب کے اندر کرنا بھُول گیا اور اُس کی غلطی نے اُسے پکڑوا دیا۔ سمجھے بُدّھو میاں!"

شوکت نے پوچھا۔ "فرض کرو۔ تمہارا خیال غلط نکلتا۔ یعنی یہ گھڑی رشید کی نہ ہوتی بلکہ اُسی کی ہوتی۔"

"تو کیا؟" ظہیر نے جواب دیا۔ "میں معافی مانگ کر چلا جاتا اور کہیں اور تلاش کرتا۔ خیر چلو۔ زیادہ دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑی اور آسانی سے کام بن گیا۔ اب میاں رشید سے خوب مٹھائی کھائیں گے۔"

دونوں خیمے میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ کسی نے باہر سے آواز دے کر کہا۔ "کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

شوکت اُٹھ کر پردے کے پیچھے چھُپ گیا۔ اور ظہیر نے جلدی جلدی چُغّہ پہنا۔ داڑھی لگائی اور بھاری آواز میں بولا۔ "آ جاؤ بیٹا!"

رشید رونی صورت بنائے اندر آیا اور مُنہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ظہیر مُسکرا کر بولا۔ "لو بیٹا! تمہاری گھڑی مل گئی مگر تمہیں مُنہ مانگا معاوضہ دینا پڑے گا۔"

رشید خوش ہو کر بولا۔ "فرمایئے، فرمایئے، کتنا؟ میں دس روپے تک دینے کو تیّار ہوں۔"

"تو یہ لو۔" ظہیر نے جیب سے گھڑی نکال اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ "دیکھو یہی تھی نا تمہاری گھڑی؟"

رشید نے گھڑی دیکھی تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ ایک دم ظہیر کے ہاتھ چوم لیے اور سر جھُکا کر بولا۔ "آپ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مجھے اپنا مُرید بنا لیجیے؟"

ظہیر نے اُسے روکنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تو ہاتھ کے جھٹکے سے ڈاڑھی نیچے گر پڑی۔ رشید نے حیرانی سے اُسے دیکھا اور چیخ کر بولا۔ ”ارے ظہیر تم۔۔۔؟“

اب تو شوکت بھی باہر آ گیا اور دونوں قہقہے مارنے لگے۔

دُوسرے دِن اسکول میں بڑی تفریح رہی۔ رشید نے دس روپے کی مٹھائی منگا کر تمام لڑکوں میں تقسیم کی اور سب کے سامنے ظہیر سے اپنی پچھلی خطاؤں کی معافی مانگی۔ اگلے ہفتے اسکول میں جلسہ ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے ظہیر کی بہت تعریف کی اور بولے۔ ”مُجھے اُمّید ہے کہ یہ ہونہار لڑکا بڑا ہو کر بُہت بڑا جاسوس بنے گا۔

پاگل چور

ظہیر اور شوکت اسکول سے آکر بیٹھے ہی تھے کہ ناہید گھبرائی ہوئی آئی اور آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”ارے بھائی جان! غضب ہو گیا۔ خُدا قسم ایسی انوکھی بات۔۔۔۔ بس کیا بتاؤں۔ تم سُنو تو حیران رہ جاؤ۔“

ظہیر حیرت سے اس کے مُنہ کو تکنے لگا اور شوکت مُسکرا کر بولا۔ کہ بتاؤ تو کیا بات ہے؟ کسی بھینس نے انڈا دیا یا مرغی کے انڈے سے بھینس کا بچہ نکلا؟“

ناہید نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ ”پہلے یہ بتاؤ تمہیں پریوں پر یقین ہے؟“

ظہیر نے پوچھا: ”کیوں؟ کیا تم نے کسی پری کو دیکھا ہے؟“ ناہید بولی: ”ہاں! ابھی ابھی۔ کُچھ دیر ہوئی۔ میں سمجھتی تھی کہ پریاں بڑی اچھّی ہوتی ہیں مگر وہ تو میری گُڑیا کا گھر ہی چُرا لے گئیں۔“

شوکت قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔ ”بڑی ذلیل نکلیں (گا کر)

ارے کیا ملا تُم کو میری گڑیا کو بے گھر کر کے ارے کیا ملا۔ ارے ہاں! ہاں! کیا ملا“

ظہیر ایک کُرسی کھینچ کر بولا۔ ”اچھّا ناہید بہن! پہلے تم آرام سے بیٹھ جاؤ اور پھر الف سے لے کر یے تک پوری کہانی سناؤ۔“

ناہید سنبھل کر بیٹھ گئی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”بات یہ ہوئی کہ میں دروازے میں بیٹھی گھڑیوں سے کھیل رہی تھی کہ ایک بُوڑھا آدمی جس کا قد مُجھ سے تھوڑا ہی اونچا تھا، دہلیز پر آ کر بیٹھ گیا۔ بُہت بھوکا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ترس کھا کر دو روٹیاں اور تھوڑا سا سالن لا کر دے دیا۔ اس نے ایک روٹی تو کھالی اور دوسری یہ کہ کر جیب میں رکھ لی کہ ”یہ میں اپنی گلہریوں کو کھلاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”بابا! یہ بھی تم ہی کھالو۔ گُلہریوں کے لیے میں اور لائے دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اندر گئی اور روٹی لے کر واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ۔۔۔۔۔“

”کہ بُڈّھا تمہاری گڑیا کا گھر لے کر رفو چکّر ہو گیا ہے۔“ شوکت ہنس کے بولا: ”مگر

ننھّی بی بی اس میں پریوں کی کیا بات ہوئی؟ صاف بات ہے کہ بُوڑھا چور تھا۔ بے ایمان تھا۔ اُچکّا تھا اور اسی نے تمہاری گڑیا کا گھر چُرایا۔"

"مگر میں یہ نہیں مانتی۔" ناہید ناک چڑھا کر بولی۔ "اُس کی صُورت سے معلُوم ہوتا تھا کہ بہت ہی شریف آدمی ہے۔"

شوکت نے مُسکرا کر پُوچھا۔ "تو تمہارا خیال ہے کہ گڑیا کا گھر پریاں اُڑا لے گئی ہیں؟ ہاہاہا (گا کر)

ارے اڑن کھٹولے پے اُڑ جاؤں ترے ہاتھ نہ آؤں۔ آں۔ آں۔ آں ترے۔"

ناہید تُنک کر بولی۔ "پوری بات تو سُنو۔ گانا شروع کر دیا۔ جب بُوڑھا چلا گیا تو یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ دروازہ میں ننّھے ننّھے پیروں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ اتنے ننّھے ننّھے اور چھوٹے چھوٹے کہ اُنگلی کے پوروں سے بس ذرا ہی بڑے ہوں گے۔ اب بتاؤ اتنے ذرا سے پیَر کسی آدمی کے ہوتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ پریاں ہی گڑیا کا گھر لے گئی ہیں۔"

ظہیر اب تک چُپ چاپ بیٹھا ناہید کی باتیں سُن رہا تھا۔ انگڑائی لے کر بولا۔ ”اچھّا ناہید بہن! اب تو تم جاؤ۔ ہم سوچیں گے۔ معاملہ بڑا اُلجھا ہوا ہے۔ شاید سمجھ میں آ جائے۔“

ناہید جانے کے لیے اُٹھی مگر پھر کُچھ سوچ کر رُک گئی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ ”ارے ہاں! یہ چاقو مجھے سیڑھیوں پر پڑا مِلا ہے۔ شاید اس بُوڑھے کی جیب سے گِر پڑا ہو گا۔“

ظہیر نے ناہید کے ہاتھ سے چاقو لے لیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ ناہید چلی گئی۔

”یہ چاقو۔ عجیب سا چاقو ہے۔“ ناہید چلی گئی تو ظہیر نے بولا۔

شوکت ہنس کر بولا۔ ”چلو پنسلیں بنانے کے کام ہی آئے گا (گا کر)

مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا۔“

ظہیر سوچتے سوچتے ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور جمائی لے کر بولا۔ ”چلو شوکت! ذرا گھُوم آئیں۔“

شوکت حیرت سے بولا: یہ کون سا وقت ہے گھومنے کا! ابھی تو اسکول سے لیفٹ رائٹ کر کے آئے ہیں۔"

ظہیر کوٹ پہنتے ہوئے بولا۔ "جو میں کہوں وہ کرو۔ ہمیں شام تک اس بُوڑھے کا پتا لگانا ہے جو ناہید کی گُڑیا کا گھر چُرا کر لے گیا ہے۔ چلو اُٹھو۔۔۔۔"

گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچے تو شوکت رُک کر بولا: "ارے خُدا کے عجیب و غریب بندے۔ تیرا دماغ ہے کہ ہٹلر کی دُم؟ بات ایک دفعہ کھوپڑی میں سما جائے، بس اُسی پر اَڑ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں میاں برخوردار طُول عمرہ۔ اس جلتی دوپہر میں اس منحوس بُڈّھے کو کہاں ڈھونڈنے پھرو گے؟"

ظہیر سُنی اَن سُنی کر کے بولا۔ "کیوں شوکت! شہر میں کتنے باغ ہیں؟"

شوکت نے اُنگلیوں پر گِن کر کہا۔ "ایک لاٹ صاحب کا باغ۔ ایک خان بہادُر کا باغ اور ایک اندھیرا باغ اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ مگر کیوں؟ باغ میں جا کر کیا کرو گے؟ آم کھانے ہیں؟"

"نہیں پیڑ گننے ہیں۔" ظہیر نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "میرے خیال میں وہ بُوڑھا ضرور کسی باغ میں ہی رہتا ہو گا۔"

شوکت چلتے چلتے رُک گیا اور ظہیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "یہ تُم سے کو اُلّو کے پٹھّے نے کہا کہ وُہ باغ میں رہتا ہے۔"

"کہا تو کسی نے نہیں۔ مگر عقل بھی کوئی چیز ہے۔" ظہیر بولا: "بُوڑھا کہتا تھا کہ یہ روٹی میں گُلہروں کو کھلاؤں گا اور گُلہریاں زیادہ تر باغوں ہی میں ہوتی ہیں۔"

شوکت پھڑک اُٹھا اور ظہیر کی پیٹھ ٹھونک کر بولا۔ "واہ وا! جیتے رہو برخوردار۔ بعض وقت تو تم ایسی عقلمندی کی بات کہتے ہو کہ حکیم لقمان بھی کہہ اُٹھے کہ واہ سبحان اللہ! جاؤ اگر میں پاکستان کا وزیرِ اعظم بن گیا تو تمہیں بھنگیوں کا جمعدار بنا دوں گا۔ ارے ع

میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے میرے مولا۔ بُلا لو۔ اہے بُلا لو

مگر یہ تو بتاؤ، کون سے باغ میں چلو گے؟"

ظہیر سوچتے ہوئے بولا۔ ”یہ اندھیرا باغ کِتنی دور ہو گا؟“

شوکت سٹ پٹا کر بولا: ”کیا کہا؟ اند اند اندھیرا بابا باغ؟ اس میں تو سُنا ہے کہ بھ بھ بھُوت بھُوت رہتے ہیں۔ میری توبہ! ہیں تو اپنے گھر جا رہا ہوں۔ مجھے ماسٹر صاحب کے بَید سے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا اِن بھ بَھ بَھوتوں سے لگتا ہے۔“

ظہیر ٹھہر کر بولا۔ ”اگر تُجھے میرے ساتھ چلنا ہے تو خاموشی سے چل۔ ورنہ بھاگ جا! میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔“

شوکت نے پیار سے کہا۔ ”ارے تم خفا کیوں ہوتے ہو؟ تمہاری خاطر بھوت تو کیا، اگر مجھے چمگادڑوں کے گھونسلوں میں بھی گھُسنا پڑے تو بھی کوئی پروا نہیں۔ جہاں تم وہاں ہم (کان پر ہاتھ رکھ کر) ارے ع

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی دنیا آں آں آں۔۔۔۔۔“

شہر سے پانچ میل پرے پُرانے وقتوں کا ایک باغ تھا۔ ویران اور اُجاڑ۔ لوگ کہتے تھے، اس میں بھُوت رہتے ہیں اور ان بھوتوں کا خوف ان کے دِلوں میں اِتنا

بیٹھا ہوا تھا کہ وہ باغ میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ظہیر کا دِل کہہ رہا تھا کہ بُوڑھا کسی باغ میں رہتا ہے۔ مگر اسے یہ یقین نہ تھا کہ وہ اندھیرا باغ ہی ہے۔ اس نے سوچا اگر اس باغ میں نہ ملا تو کسی اور باغ میں تلاش کریں گے۔

جب وہ اندھیرا باغ میں داخل ہوئے تو ایک دفعہ تو ظہیر بھی کانپ اُٹھا مگر اُس نے اپنا خوف چھپائے رکھا اور شوکت کی ہمّت بندھانے کے لیے آگے آگے چلنے لگا۔ بہت سی جھاڑیوں، گڑھوں اور گھنے درختوں کو پار کر کے وہ باغ میں پہنچے تو انھیں ایک بُوڑھا شخص دکھائی دیا جو ایک گرے ہوئے پیڑ کے پاس کھڑا جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ ظہیر کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ بُوڑھے نے انہیں غور سے دیکھا اور جیبیں ٹٹول کر بولا۔ ”نہ جانے کمبخت چاقو کہاں گر پڑا۔ مُجھے درخت کی چھال کاٹنی تھی۔ میاں صاحبزادے تمہارے پاس چاقو ہو تو ذرا دے دو۔ ابھی واپس لے لینا۔“

ظہیر نے جیب سے چاقو نکال کر اُسے دے دیا اور بولا۔ ”یہ مجھے ایک جگہ پڑا ملا تھا۔ ممکن ہے آپ ہی کا ہو۔“

بُوڑھا چاقو لے کر بولا: ”اوہو! یہ تو میرا ہی ہے۔ جیتے رہو میاں صاحب زادے۔ بہت بہُت شکریہ!“

اُس نے جلدی جلدی درخت کی چھال کاٹی اور پھر ایک جھاڑی کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔

”یہی وُہ بُوڑھا ہے جو ناہید کی گڑیا کا گھر چُرا لایا ہے۔“ ظہیر جوش سے بولا۔ ”چلو شوکت اس کا پیچھا کریں۔“

دونوں آہستہ آہستہ دبے پاؤں بُوڑھے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی دور جا کہ

وہ ایک جھونپڑے میں گھس گیا۔ جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ کر ظہیر زور سے کھانسا اور بولا۔ ”بڑے میاں! کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟“

بُوڑھا بولا۔ ”آ جاؤ بھائی۔ کون ہو؟“ دونوں اندر چلے گئے۔ بوڑھا زمین پر بیٹھا چھال چھیل رہا تھا اور اس کے سامنے ناہید کی گُڑیا کا گھر رکھا ہوا تھا۔ شوکت اُچھل کر بولا۔ ”بڑے میاں! اگر آپ کوئی بھُوت ہیں تب تو میں آپ کو کچھ نہیں کہتا اور جو آپ میری ہی طرح کے انسان ہیں تو مہربانی کر کے بتایئے کہ یہ گڑیا کا گھر آپ ہمارے گھر سے کیوں چُرا لائے؟ کیا نیکی کا بدلہ بدی سے دیا جاتا ہے۔ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ شوق سے کہئے۔ میں پھر کہہ لُوں گا۔“

بُوڑھے نے دونوں کو غور سے دیکھا اور مُسکرا کر بولا۔ ”اچھّا تو تم اس ننّھی کے بھائی ہو۔ بیٹھ جاؤ میاں! میں تُمھیں پورا قِصّہ سُناتا ہوں۔“

ظہیر اور شوکت چٹائی پر بیٹھ گئے تو بُوڑھا بولا۔ ”میاں! نہ تو میں چور ہوں اور نہ اُچکّا بلکہ تمہاری ہی طرح ایک شریف آدمی ہوں۔ یہ باغ میرا ہے اور میں یہاں برسوں سے رہ رہا ہوں۔ آج میں یونہی ٹہلنے کے لیے شہر گیا تھا۔ گھومتے

گھومتے اِتنا تھک گیا کہ آرام کرنے کے لیے ایک دروازے پر بیٹھ گیا جہاں ایک ننھّی بچّی کھیل رہی تھی۔ وہ مُجھ سے بڑی مہربانی سے پیش آئی اور اس نے مُجھے کھانے کے لیے روٹی بھی دی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی گڑیا کا گھر ٹوٹا ہوا ہے۔ چلتے وقت وہ میں نے اُٹھا لیا کہ ٹھیک کر کے دے دوں گا۔ بڑی بھولی بھالی اور پیارہ بچّی ہے۔"

شوکت بولا۔ "جی یہ میری بہن ناہید کی گڑیا کا گھر ہے اور وہ سمجھ رہی ہے اسے پریاں اُڑا کر لے گئی ہیں کیوں کہ زمین پر ننّھے ننّھے پیروں کے نشان لگے ہوئے تھے۔"

بُوڑھا کِھل کھلا کر ہنس پڑا اور بولا۔ "پریاں! ٹھہرو میں تمھیں پریاں دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک چھوٹا سا پُتلا نکال کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ ظہیر اور شوکت حیرت سے اُس پتلے کو دیکھ رہے تھے کہ بُوڑھے نے پُتلے کا پیٹ دبایا تو وہ آدمیوں کی طرح چلنے لگا۔ شوکت ڈر کر ظہیر سے چمٹ گیا اور خوف بھری آواز میں بولا۔ "ارے بھ بھ بھُوت۔ بھُوت!"

بُوڑھا ہنس کر بولا۔ ”یہ بھُوت نہیں میاں! لکڑی کا کھلونا ہے جِسے میری کاریگری نے آدمی بنا دیا ہے۔ کِسی زمانے میں مَیں ایک بہترین بڑھئی تھا۔ مُجھے بڑے بڑے لوگوں نے اِنعام دیے ہیں۔ لیکن افسوس! آج دنیا والے مُجھے پاگل کہتے ہیں۔ یہ لو میں نے گڑیا کا گھر میں نے ٹھیک کر دیا ہے۔ اسے ننّھی کو دے دینا اور یہ کھلونا بھی۔ فُرصت ملی تو میں پھر کبھی آؤں گا۔“

واپس لَوٹتے وقت شوکت ہنس کر بولا۔ ”دُنیا میں بھی بھانت بھانت کے جانور پائے جاتے ہیں۔ اِن بڑے میاں ہی کو دیکھو۔ ان کے پاگل ہونے میں شُبہ ہے؟

ارے ع

دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گیا ے دنیا۔۔۔ ارے واہ دُنیا۔۔۔۔۔۔“

بِلّی کی تلاش

”ارے

مری ماں چاند سا بیٹا بڑی مُشکل سے مِلتا ہے مری ماں چا آ آ آند سا۔ ارے چاند سا۔۔“

شوکت گاتا ناچتا تانیں اُڑاتا کمرے میں داخل ہوا اور اِدھر اُدھر گھُور گھُور کر دیکھنے لگا۔

ظہیر آرام کرسی پر لیٹا کُچھ سوچ رہا تھا۔ مگر شوکت ایسا بن گیا جیسے اُس نے ظہیر کو دیکھا ہی نہیں۔ چنگھاڑ کر بولا۔ ”ارے ظہیر! او میاں صاحب زادے۔ کدھر غائب ہو گئے؟“

ظہیر ہنس کر بولا۔ ”کیا سُجھائی کم دینے لگا ہے؟ سامنے تو بیٹھا ہوں۔“

شوکت چونک کر بولا۔ ”ارے! لاحول ولا قوۃ! تو یہ تم ہو؟ میں سمجھا کوئی لومڑی

بیٹھی ہے۔" "تمہارا دماغ خراب ہے۔" ظہیر نے جواب دیا۔ "لومڑی اور کمرے میں! ہونھ۔"

یہ کہہ کر وہ پھر کُچھ سوچنے لگا۔

شوکت قریب آ کر بولا۔ "خُدا قسم! جس وقت بھی میں تم سے ملنے آتا ہوں، تم کُچھ نہ کچھ سوچتے ہی ہوتے ہو۔ میں کہتا ہوں یہ کیسی افیمیوں کی سی عادت ہے؟ ارے مردِ خُدا! دیکھ تو کیسا سُہانا موسم ہے۔ سورج نکلا ہوا ہے۔ چاند کی سُنہری کرنیں پھُولوں پر جھِلملا رہی ہیں۔ تارے چھٹکے ہوئے ہیں۔ آسمان پر مست گھٹائیں جھُوم رہی ہیں۔ بھلا یہ وقت گھر میں بیٹھنے کا ہے؟ چل کِسی باغ میں چل کر ٹہلیں۔"

ظہیر سر ہلا کر بولا: "اُوں ہُنک۔ تو ہی چلا جا۔ میں اس وقت ایک نہایت ہی اہم معاملے کے متعلّق سوچ رہا ہوں۔"

شوکت نے جھُک کر اُس کا چہرہ دیکھا اور پھر ہونٹ لٹکا کر بولا۔ "اہم معاملہ؟ ارے کوئی جاسوسی واسُوسی کا قصّہ تو نہیں؟"

"بات تو کُچھ ایسی ہی ہے۔" ظہیر نے ہنس کر جواب دیا۔

شوکت زبان نکال کر بولا۔ "ہت تیرے کی۔ وہ تو میں پہلے ہی سمجھتا تھا (گا کر) ارے

ع تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔"

ظہیر جھنجلا کر بولا۔ "تُجھے بَک بَک کرنی ہے تو باہر چلا جا۔ میں اس وقت بُہت پریشان ہوں۔"

"میاں برخوردار! یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ پریشانی کیا ہے؟" شوکت نے مٹک کر پُوچھا۔ "بول شاید میں کُچھ علاج بتا سکوں۔"

ظہیر نے پہلے اس کی صورت کو غور سے دیکھا اور پھر بولا۔ "یہ جو گلی کے نکّڑ پر وکیل صاحب رہتے ہیں نا۔ آج میں اُن کے گھر گیا۔ تو ان کی بیوی جنہیں میں چچی چچی کہتا ہوں، پریشان بیٹھی تھیں۔ میں نے سبب پُوچھا تو اُنہوں نے بتایا کہ اُن کی بِلّی نرگس صُبح سے گُم ہے۔ سارا محلّہ چھان مارا مگر کہیں پتہ نہیں چلا۔ بڑی پیاری

بِلّی تھی۔ تم جانتے ہی ہو، بے چارے وکیل صاحب کے کوئی بچّہ بھی نہیں۔ دونوں میاں بیوی اس بِلّی سے بچّوں جیسی محبّت کرتے ہیں۔ میں چچی سے وعدہ کر آیاہوں کہ نرگس کا کھوج لگانے کی کوشش کروں گا۔"

"کوشش کروں گا۔" شوکت مُنہ چڑا کر بولا۔ "جیسے دُنیا بھر کی کھوئی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈھنے کا تم ہی نے ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ارے خُدا کے بندے گندے! ذرا سوچ تو سہی۔ تُو اس بِلّی کی بچّی کو ایسی چلچلائی دھوپ میں کہاں ڈھونڈتا پھِرے گا؟ سورج سوا نیزے پر کھڑا، لو چل رہی ہے۔ سڑکیں سنسان پڑی ہیں اور۔۔۔"

ظہیر مُسکرا کر بولا۔ "مگر تُو تو ابھی کہہ رہا تھا کہ گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ باغوں میں کوئِل کوک رہی ہے۔ ایں۔۔۔۔؟"

شوکت سر کھُجلانے لگا اور شرمندگی مٹانے کو کُچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ جاوید بھاگا ہوا آیا اور بولا۔ "ارے بھائی جان! کِتنی عجیب بات ہے۔ عجیب بھی اور خطرناک بھی۔۔۔"

شوکت نے پُوچھا۔ ”کون سی بات؟ کیا کوئی آدمی سر کے بل سڑک پر چل رہا ہے؟“

جاوید بولا۔ ”نہیں۔ شیر! میں ابھی کاکا کی دُکان پر ایک شیر دیکھ کر آیا ہوں۔“

”ہائے میرے اللہ!“ شوکت ڈر کر ظہیر سے چمٹنے لگا۔

ظہید مُسکرا کر بولا۔ ”کیسا شیر جاوید میاں! صاف صاف بتاؤ۔ کیا تم نے سچ مُچ کوئی شیر دیکھا ہے؟“

جاوید بولا۔ ”شیر کو نہیں دیکھا۔ اُس کا عکس دیکھا ہے۔ کاکا کی دُکان پر جو بڑا سا آئینہ لگا ہے نا، میں اس کے قریب سے ہو کر گُزرا تو اس میں مجھے ایک بڑا ہی خوف ناک شیر دکھائی دیا۔ اُفّوہ۔۔۔“

شوکت نے ہنس کر کہا: ”کاکا کی دُکان میں چُوہے زیادہ ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے شیر پال لیا ہو گا۔“

ظہیر نے کہا: ”جاوید میاں کوئی تصویر یا مورتی ہو گی؟“

”نہیں بھائی جان!“ جاوید ہاتھ ہلا کر بولا۔ میں نے اُسے چلتے پھرتے دیکھا اور ایک دفعہ تو اس نے اتنے زور سے مُنہ پھاڑا کہ میں ڈر کے بھاگ آیا۔“

ظہیر اُٹھ کر بولا۔ ”چلو تو شوکت! دیکھیں کیا مُعاملہ ہے۔“ گلی کے موڑ پر ہی کاکا کی دُکان تھی جس میں پرانا سامان، میزیں، کُرسیاں، صندوق اور دُنیا بھر کا کاٹھ کباڑ فروخت ہوتا تھا۔ شوکت چلتے چلتے بولا۔ ”لو یہ ایک اور ہوئی۔ پہلے تو بِلّی کی مُصیبت تھی۔ اب شیر کو بھی ڈھونڈنا پڑ گیا۔ اے آں (گا کر)

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تیری گلی میں ارے کس چیز کی کمی۔ آں آں۔۔۔۔۔۔“

ظہیر ڈانٹ کر بولا۔ ”سڑک پر لوگ چل رہے ہیں۔ کہیں گے کیسے بد تمیز لڑکے ہیں۔ بازاروں میں گاتے پھرتے ہیں۔“

شوکت گردن ہلا کر بولا۔ ”گاتے ہیں تو کِسی کا کیا لیتے ہیں؟ ارے

ایک لڑکی بگھارتی تھی دالدال کرتی تھی عرض یوں احوالا ایک دن تھاہری بھری
تھی یوں مارے ایک دن تھا۔ اہے ایک دن تھا۔ آں آں"

دوپہر کا وقت۔ گرمی بلا کی پڑ رہی تھی۔ وہ کاکا کی دُکان پر پہنچے تو دکان میں ایک
بھی گاہک نہ تھا۔ صرف کاکا ایک کُرسی پر بیٹھے پُرانے رجسٹر اُلٹ پُلٹ کر رہے
تھے۔ ظہیر بولا۔ "السلامُ علیکم کاکا! ہم نے سُنا ہے کہ آپ نے کوئی شیر پال رکھا
ہے؟ ذرا ہمیں بھی تو دِکھایئے۔"

کاکا نے بھاڑ سا مُنہ پھیلا دیا اور پوپلے مُنہ میں زبان پھرا کر بولے۔ "شیر! ارے
میاں! میں نے آج اب تک چوہیا کا بچّہ بھی نہیں پالا۔ شیر تو بڑی چیز ہے؟"

ظہید نے ہنس کر کہا۔ "ابھی ابھی جاوید میرے پاس آیا تھا۔ کہتا تھا کہ میں نے کاکا
کی دُکان کے آئینہ میں شیر کا عکس دیکھا تھا۔

کاکا قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور بولے "لو اور سُنو۔ ذرا تُم بھی دیکھ لو۔ کہیں تمہیں
بھی کہیں شیر نظر آ رہا ہے۔" ظہیر مُسکراتا ہوا آئینہ کے پاس پہنچا اور اپنی
صُورت جو دیکھی تو زور کا قہقہہ لگایا۔ آئینہ عجیب سا تھا۔ اس میں اُس کا چہرہ ہا تھی

کے برابر اور جسم ایک دیو کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

کاکا اپنی چھدری داڑھی کھُجلاتے ہوئے بولے۔ ''بھئی! اس آئینے میں یہ صفت ہے کہ چھوٹی چیز اس میں بڑی نظر آتی ہے۔ میں نے اسے سستے داموں خرید ا تھا اور اب چاہتا ہوں کہ تھوڑا سا نفع لے کر بیچ ڈالوں۔ مگر ابھی تو کسی نے اس کا مول تول نہیں کیا۔ کیوں تُم کیا سوچ رہے ہو؟''

ظہیر چونک کر بولا۔ ''ہُوں! اب میری سمجھ میں آیا۔ جاوید نے آئینہ میں کِسی بِلّی کا عکس دیکھا ہو گا۔''

''بِلّی۔۔۔'' کاکا داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''میں تمھیں ایک اچنبھے کی بات سُناؤں۔ ابھی ابھی میرا لڑکا کھانا لے کر آیا تھا۔ میں نے کھانا میز پر رکھ دیا اور خود ہاتھ دھونے چلا گیا واپس آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ سالن کا پیالہ صاف رکھا ہے اور روٹیاں بھی غائب ہیں۔''

''ہاہا۔'' شوکت ہنس کر بولا۔ ''لو میاں جاسوس صاحب! اب کاکا کے کھانے کا بھی کھوج لگاؤ۔''

ظہیر بولا۔ ”صاف ظاہر ہے کہ یہ بِلّی ہی ہے جو آپ کا کھانا چٹ کر گئی۔“

کاکا بولے۔ ”مگر بھئی! میری دُکان میں تو بِلّی وِلّی کُچھ بھی نہیں۔ ہاں۔ وکیل صاحب کی بِلّی نرگس ضرورت آجاتی ہے۔ بڑی پیاری بِلّی ہے۔ مُجھ سے بہت ہلی ہوئی ہے۔“

”ہے نہیں، تھی کہیے۔“ شوکت نے جلدی سے کہا۔ ”کیونکہ آج صُبح سے وہ غائب ہے اور اب ہم اور ہمارے جاسوس جناب ظہیر اُس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہائے ہائے۔“

ظہیر نے کاکا سے پوچھا۔ ”جب آپ ہاتھ دھو کر واپس آئے تو آپ کو بِلّی آتی جاتی یا بھاگتی نظر نہ آئی؟“

”دیکھنا کیسا مُجھے بِلّی کا خیال تک بھی نہ تھا۔“ کاکا نے جواب دیا۔ ”مگر وہ نرگس کیسے گُم ہو گئی۔ صُبح تو میرے ساتھ ناشتہ کر کے گئی ہے۔“

ظہیر سُنی ان سُنی کر کے بولا۔ ”کُچھ نشان بھی ہو، جس سے معلُوم ہو سکے

کہ۔۔۔۔"

کاکا بولے۔ "تم خود ہی دیکھ لو بیٹا۔ یہاں نشان تو کوئی نہیں۔"

ظہیر دُکان میں چل پھر کر کونے کھُدروں کو دیکھنے لگا۔ جب وہ ایک بڑی سی الماری کے قریب پہنچا تو اُس کی نظر ایک اخبار کے پھٹے ہوئے ورق پر پڑی۔ اُس نے نیچے جھک کر ورق اُٹھالیا اور کاکا سے پوچھا۔ "یہ ورق یہاں کیا ہے؟"

کاکا بے خیالی میں کھڑے کچھ سوچ رہے تھے۔ بولے۔ "ارے ہاں! ظہیر میاں! ایک بات یاد آ گئی۔ میں ہاتھ دھو کر واپس آیا تو مُجھے اس الماری کے پرلی طرف کھٹرکے کی آواز آئی۔ اس الماری کے پیچھے ایک صندوق رکھّا تھا جسے میں صاف کرتا تھا۔ مگر کھانا آنے کے بعد اُسے کھلا ہوا چھوڑ کے ہاتھ دھونے چلا گیا۔ اس کا ڈھکن کسی طرح آپ ہی آپ بند ہو گیا ہو گا اور اُسی کی یہ آواز ہو گی جو مُجھے سُنائی دی۔

ظہیر ورق دِکھا کر بولا۔ "مگر یہ ورق کہاں سے آیا؟"

کاکا بولے۔ ”یہ ورق اُسی صندوق پر چپکا ہوا تھا۔ میں نے ابھی ابھی چھُڑا کر پھینکا۔ مگر کیوں؟“

شوکت بولا۔ ”اس پر بِلّی کے پنجے لگے ہوئے ہیں۔ اچھّا وہ صندُوق کہاں ہے؟ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”صندُوق؟“ کاکا بولے۔ ”وہ تو جا چُکا۔“

”جا چُکا؟ کہاں؟“ ظہیر کی ساری محنت پر پانی پھرنے لگا۔

کاکا نے جواب دیا۔ ”مرزا صاحب کے گھر۔۔۔ اس صندُوق کا سودا وہ کل ہی کر چُکے تھے۔ آج اُن کا نوکر اُٹھا کر لے گیا۔“

”مرزا صاحب؟ تو گویا آپ اُنہیں جانتے ہیں؟“ ظہیر نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

کاکا بولے۔ ”لو بھئی! مرزا غلام حیدر کو کون نہیں جانتا۔ میرے تو پُرانے شناسا ہیں۔ رعنا روڈ پر اُن کا عالی شان مکان ہے۔ بھائی! وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔“

ظہیر خُوشی سے اُچھل پڑا اور شوکت سے بولا۔ ”ارے کم بخت جلدی کر۔ ہمیں مرزا صاحب کے گھر پہنچنا ہے۔“

شوکت سر پر ہاتھ مار مار کر بولا۔ ”یا وحشت! پہلے بِلّی۔ پھر شیر۔ پھر کھانا اور اب صندُوق۔ اے اللہ! کِس کِس کو ڈھونڈوں۔“

ایک گھنٹہ بعد وُہ ہانپتے کانپتے مرزا صاحب کے مکان پر پہنچے۔ مرزا صاحب بیٹھک میں بیٹھے دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر گھبرا گئے اور جلدی سے بولے۔ ”کہو میاں کیا بات ہے؟“

ظہیر بولا۔ ”جناب آپ کباڑی کی دکان سے کوئی صندُوق خرید کر لائے ہیں؟“

مرزا بولے۔ ”ہاں ہاں! کیوں؟ “

”آپ نے اُسے کھولا تو نہیں؟“ ظہیر نے بے صبری سے پوچھا۔

”نہیں، ابھی تو نہیں کھولا۔ مگر کُچھ کہو تو سہی کیا بات ہے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ ظہیر بولا۔ ”پہلے مُجھے صندُوق دِکھا دیجیے۔“ مرزا صاحب

انہیں اُس کمرہ میں لے گئے جہاں صندُوق رکھا تھا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے بولے۔ ”یہ ہے وہ صندُوق۔ اب بتاؤ کیا مُعاملہ ہے؟“

ظہیر بولا۔ ”شوکت! جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر دو۔۔۔“ شوکت نے دروازہ بند کر دیا تو ظہیر نے صندُوق کا ڈھکن کھول دیا۔ میاؤں کی ایک باریک سی آواز آئی اور بی نرگس ایک چھلانگ لگا کر ظہیر کی گود میں آ دُبکیں۔

مرزا صاحب مُنہ کھولے کبھی ظہیر کو دیکھتے اور کبھی بِلّی کو۔ شوکت بولا۔ ”آپ کُچھ کہنا چاہتے ہیں؟ کہیے کہیے۔ شوق سے کہیے۔“

ظہیر نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“

اور تب مرزا صاحب نے پورا واقعہ سُن لیا تو خُوش ہو کر بولے۔ ”شکر کرو میاں! میں نے صندُوق کا ڈھکن نہیں کھولا تھا ورنہ آپ کی مانو پھر کبھی ہاتھ نہ آتی۔“

”کیوں یار۔۔۔!“ چلتے چلتے شوکت بولا۔ ”کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں کہ تو کہیں آدمی کے بھیس میں بھُوت تو نہیں؟ یار دیکھ سچ مچ بتا دے کیونکہ بھ بھ بھوتوں سے مُجھے بہُت ڈر لگتا ہے۔“

ظہیر ہنس پڑا اور نرگس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ”اس میں بھوتوں کی کونسی بات ہے؟“

شوکت نے کہا۔ ”دیکھو نا! وہ بال کی کھال نکالتے ہو کہ کوئی خرانٹ جاسوس بھی کیا نکالے گا۔ سچ پُوچھو تو میری سمجھ میں یہ قصّہ ابھی تک نہیں آیا۔ تُم نے کیسے سمجھا کہ صندُوق میں نرگس بند ہے؟“

ظہیر سُن کر بولا۔ ”ارے بھولے بھائی! سُن، میں دُکان پر صرف شیر کا نام، سُن کر گیا۔ مگر جب آئینہ میں صُورت دیکھی تو پتا چلا کہ جاوید کو آئینہ میں شیر نہیں بلکہ کسی بِلّی کا عکس دکھائی دیا ہوگا اور جب کاکا نے کھانا گُم ہونے کا قصّہ سُنایا تو یہ خیال اور پکّا ہو گیا۔ اب مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ دُکان میں بِلّی ضرور آئی ہے۔ مگر بلّی کون سی ہے اور وہ کہاں گئی؟ یہ خبر نہ تھی۔ لیکن جب کاکا نے صندُوق کا ڈھکنا بند ہونے کا واقعہ سُنایا تو میں چونک پڑا۔ بات یہ ہوئی کہ جب کاکا ہاتھ دھو کر واپس لوٹے تو نرگس جو اس کا کھانا مزے سے چٹ کر رہی تھی، آہٹ پا کر بھاگی اور چھُپنے کے لیے صندُوق میں گھُس گئی۔ جھٹکے سے صندُوق کا ڈھکن بند ہو گیا اور بی نرگس اندر قید ہو گئیں۔ سمجھے؟“

”سمجھ گئے۔“ شوکت بولا۔ ”مگر یہ نرگس کی بچّی مکان میں پہنچی کیسے؟“

ظہیر مُسکرا کر بولا۔ ”یہ بات ذرا ٹیڑھی ہے مگر سُنو۔ مُجھے معلُوم تھا کہ نرگس روز صُبح کو کاکا کے گھر جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب کاکا گھر سے دُکان کی طرف چلے تو وہ بھی اُن کے پیچھے ہولی ہو گی اور دُکان کے کسی کونے میں دُبک کر چوہوں

کی تاک میں بیٹھ گئی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ کاکا نے اُسے نہیں دیکھا۔“

”واہ میرے مٹّی کے شیر۔“ شوکت بولا۔ ”خُدا کی قسم! اگر میں کُچھ دِنوں اور تیرے ساتھ رہا تو پھر میں بھی جاسوس بن جاؤں گا۔ اور ہاں! یہ نرگس وکیل صاحب کو جب دی جائے گی جب وہ مٹھائی کھلانے کا وعدہ کریں گے۔ کیا سمجھے؟“

ظہیر بولا۔ ”بالکل ٹھیک۔ محنت بھی تو بُہت کی ہے ہم نے۔“

اور شوکت کان پر ہاتھ رکھ کر زور سے بولا۔ ارے

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کُچھ مرتبہ چاہیے

کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

اسے ہاں گُل گلزار ہوتا ہے۔ ارے واہ گُل گُلزار لاحول ولا۔ چچا جان آرہے ہیں۔“

چور کون؟

”بھائی جان! چلئے آپ کو ابّا جان بلا رہے ہیں۔“ ناہید دوپٹّہ سنبھالتی آنکھیں جھپکاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ ظہیر اور شوکت بیٹھے آنے والے امتحان کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ ظہیر نے پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟“

ناہید بولی۔ ”اب بھئی ہمیں یہ تو پتا نہیں کہ خاص بات ہے یا عام! ہم سے کہا ظہیر کو بلا لاؤ۔ سو ہم آ گئے۔“

”آ گئے۔۔۔“ شوکت مُنہ چِڑا کر بولا۔ ”اری خدا کی بندی گندی! اُن سے پُوچھنا تو تھا کہ کیا کام ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ کوئی بات ادھوری مت کہو۔ جاؤ پُوچھ کر آؤ۔“

”شوکت! کیوں خواہ مخواہ اپنی چھوٹی بہن ناہید کو دِق کرتے ہو۔“ ظہیر اُٹھتے

ہوئے بولا۔ ”چلو ناہید! ہم چلتے ہیں۔ ممکن ہے اِمتحان کے متعلّق کچھ پُوچھنا چاہتے ہوں۔“

کپتان صاحب بر آمدے میں بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے۔ ظہیر اور شوکت نے جا کر سلام کیا تو بولے۔ ”اخّاہ! کیا شوکت؟ بڑے دنوں بعد دکھائی دیے۔ بیٹھو بیٹھو۔“ پھر حُقّے کے دو چار کش لگا کر بولے۔ ”بھئی ظہیر! یہ اپنے ممتاز خاں بیرسٹر جو ہیں نا؟ ارے بھئی! وہی جو ہر اتوار کو مُجھ سے ملنے آتے ہیں۔ کل ان کے ہاں چوری ہو گئی۔ مگر بتانے سے کیا فائدہ؟ تم نے اخباروں میں سب کُچھ پڑھ لیا ہو گا۔“

”جی نہیں۔“ ظہیر بولا۔ ”میں نے ابھی تک آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ بیرسٹر صاحب نے پولیس میں رپورٹ کر دی ہے؟“

”پولیس میں خبر تو اسی وقت کر دی تھی۔“ کپتان صاحب نے کہا۔

”مگر انہیں اِطمینان نہیں۔ میں گیا تو کہنے لگے میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ ظہیر ہی اس چوری کا سُراغ لگائے گا۔ میں نے بہتیرا کہا وہ بچّہ ہے۔ اتنے بڑے معاملوں کو

نہیں سُلجھا سکتا۔ مگر وہ سر ہی ہو گئے۔ کہنے لگے فورا! اُسے میرے ہاں بھیج دو۔"

"میں ہر خدمت کے لیے تیّار ہوں۔ ظہیر مُستعدی سے بولا۔ "پہلے تو شاید بیرسٹر صاحب غالب روڑ پر رہتے تھے۔"

"اور اب بھی وہیں رہتے ہیں۔" ابّا جان بولے۔ "میرے خیال میں تم ابھی چلے جاؤ۔ بے چارے بڑے پریشان ہیں۔ اور ہونا بھی چاہیے۔ دولت کا معاملہ بڑا بُرا ہوتا ہے۔"

"بہت اچھّا تو پھر میں جاتا ہوں۔" ظہیر کھڑا ہو گیا۔ "چلو شوکت! تم بھی چلو گھر کیا کرو گے۔"

"ٹھیک ہے۔" شوکت بھی تیار ہو گیا۔ "اگرچہ مُجھے ان گورکھ دھندوں سے کوئی دلچسپی نہیں مگر تمہاری خاطر چلتا ہُوں۔"

ممتاز خاں بیرسٹر کے مکان پر پہنچ کر دونوں نے سائیکلیں ایک طرف رکھ دیں اور ظہیر نے آگے بڑھ کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم نکل کر آیا اور

بولا۔ ’’فرمایئے؟‘‘

ظہیر نے کہا۔ ’’بیرسٹر صاحب سے کہو کپتان صاحب کا لڑکا ظہیر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔‘‘

نوکر سر جھکا کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد آ کر بولا۔ ’’چلیے آپ کو یاد فرماتے ہیں۔‘‘

ممتاز خان شہر کے مشہور بیرسٹر تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کئی ایک کوٹھیوں اور مکانوں کے علاوہ بہت سے کارخانوں میں حصّہ دار بھی تھے۔ ظہیر کو دیکھتے ہی کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے ملے۔ ’’آہا۔ ظہیر میاں! خُدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔ مزاج کیسے ہیں؟‘‘ ’’شکر ہے۔‘‘ ظہیر نے جواب دیا۔ ’’آپ ہیں میرے دوست اور ہم جماعت شوکت صاحب۔۔۔۔‘‘

’’بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔‘‘ بیرسٹر صاحب بیٹھتے ہوئے بولے۔ ’’مگر بھئی ظہیر پُوری خوشی تو اس وقت ہو گی جس وقت کہ تم اس نامُراد چور کا کھوج نکالو گے۔ میں آدھے کے قریب لُٹ چُکا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر اُنھوں نے ایک گہری سانس لی اور کھوئی کھوئی نظروں سے ظہیر کو دیکھنے لگے۔

"آپ بے فکر رہیئے۔" ظہیر نے تسلّی دی۔ "میں اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھوں گا۔ ہاں اب آپ پورا واقعہ سُنایئے تاکہ میں معاملے کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو جاؤں۔"

"لمبی چوڑی بات نہیں۔" بیرسٹر صاحب بولے۔ "پہلے چائے تو پی لو۔ پھر اطمینان سے بات کریں گے۔" نوکر چائے رکھ کر چلا گیا تو ظہیر نے بیرسٹر صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ میز پر پیالی رکھ کر بولے۔ "میری عادت ہے کہ سونے سے پہلے تمام دروازوں اور کمروں کی دیکھ بھال کر لیتا ہوں۔ چنانچہ کل بھی میں پُورا اِطمینان کر کے سویا۔ رات کو کِسی قسم کی کھٹ کھٹ، آہٹ یا کوئی آواز سُنائی نہ دی اور نہ کوئی ایسا واقعہ ہوا جس سے میری آنکھ کھُل جاتی۔ صُبح کو اُٹھا تو معلُوم ہوا کہ کمرے کا تمام قیمتی سامان غائب ہے۔ لطف یہ کہ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں جوں کے تُوں بند تھے۔ خُدا معلُوم جنّوں کی یہ حرکت ہے یا بھُوتوں کی کیونکہ بغیر دروازہ یا کھڑکی کھولے کوئی انسان تو اندر گھُس نہیں سکتا۔ پولیس بھی حیران ہے اور بھئی حیرانی کی بات ہے ہی۔"

"ہوں!" ظہیر چائے کا گھونٹ لے کر بولا۔ "گھر میں نوکر کتنے ہیں؟"

"صرف چار۔" بیرسٹر صاحب چونک کر بولے۔ "یہی سوال پولیس نے بھی کیا تھا۔ مگر نوکروں کی طرف سے بالکل اطمینان رکھو۔ وہ سب کے سب ایماندار اور شریف ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس پر شک کیا جائے۔ جب سے یہ واقعہ ہوا ہے، وہ بھی بے چارے بہت پریشان ہیں اور رحمان کی حالت تو مُجھ سے بھی بدتر ہے۔ صُبح سے اس نے کھانا نہیں کھایا۔"

بیرسٹر صاحب ابھی جُملہ پورا کرنے نہ پائے تھے کہ ظہیر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دبے دبے پاؤں دروازے کے قریب پہنچا اور کواڑ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ بیرسٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟ ایکا ایکی تم کیوں اُٹھ کھڑے ہوئے؟" ظہیر نے دروازہ بند کر دیا اور واپس آ کر بولا۔ "کُچھ نہیں۔ یونہی! ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"بس" میرے خیال میں اور تو کوئی ایسی بات ہے نہیں جو سُنانے کے قابل ہو۔" انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں! تم کہو تو میں گُم شدہ چیزوں کے نام تمہیں بتا سکتا

ہوں۔"

" اس سے مُجھے بہت مدد ملے گی۔" ظہیر جیب سے کاغذ پنسل نکالتے ہوئے بولا۔

"فرمایئے!"

"علاوہ ایک سونے کی گھڑی کے۔" انہوں نے کہا۔ "بیس ہزار کی مالیت کے زیورات بھی تھے جو تجوری توڑ کر نکالے گئے۔ یوں سمجھ لو کہ کُل سامان میں تیس ہزار کے لگ بھگ چوری ہوا۔ "

"تعجّب ہے۔" ظہیر سوچتے ہوئے بولا۔ "دروازے بند رہیں۔ کھڑکیاں بند رہیں اور سامان چوری ہو جائے۔ خیر آیئے ایک نظر ذرا گھر کو بھی دیکھ لیں۔ ممکن ہے طور کوئی نشان چھوڑ گیا ہو۔"

بیرسٹر صاحب ظہیر کو ایک ایک کمرہ اور ایک ایک دروازہ دکھانے لگے۔ اس عرصے میں رحمان کئی بار ان کے پاس سے ہو کر گُزرا۔ ظہیر چلتے چلتے بولا۔ "یہ آپ کا نوکر۔ کیا نام رحمان، اس کو پتا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" بیرسٹر صاحب بولے۔ "سچ پُوچھو تو اس نے ہی مُجھے یہ رائے دی تھی کہ تمہیں بُلایا جائے۔ ہا! بے چارہ میرا بڑا خیر خواہ ہے۔ صبح سے اس نے کھانا بھی نہیں۔۔۔"

"اچھّا چلیے۔ اب اس کمرے میں چلیں جہاں سے سامان چوری ہوا ہے۔" ظہیر بات کاٹ کو بولا۔

کمرے میں پہنچ کر ظہیر کی آنکھیں تیزی سے چیزوں کا مُعائنہ کرنے لگیں۔ بظاہر کمرے کی تمام کی تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ قرینے سے رکھی تھیں۔ کسی قسم کی بے ترتیبی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ ایک طرف بڑی سی تجوری رکھی تھی۔ فرش بالکل صاف تھا۔ ایک تِنکا بھی اِدھر اُدھر دکھائی نہ دیتا تھا۔۔۔ کھڑکیاں بھی ساری بند تھیں اور چٹخنیاں لگی ہوئی تھیں۔ ظہیر ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا ہوا بائیں طرف والی کھڑکی کے قریب پہنچا تو اس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چٹخنی کے بالکل برابر تھوڑا سا شیشہ کٹا ہوا تھا۔ ظہیر نے اُسے انگلی سے دھکّا دیا تو چھن سے نیچے گِر پڑا۔ بیرسٹر صاحب اور شوکت دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ

پھاڑ کر اُس کا مُنہ تک رہے تھے۔ مگر وہ بغیر کُچھ کہے سُنے کمرے سے باہر نکل گیا اور کھڑکی کے پاس آکر ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھول دی۔

"ہا۔ دیکھا آپ نے!" وہ خوشی سے چلّا کر بولا۔ "چور کوئی بڑا شاطر معلُوم ہوتا ہے۔ اُس نے کمرے کے اندر گھُسنے کی اور کوئی صُورت نہ دیکھ کر تھوڑا سا شیشہ کاٹا اور چٹخنی کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کام کرنے کے بعد پھر سُوراخ میں ہاتھ اندر ڈال کر چٹخنی لگا دی اور مزہ یہ کہ ٹوٹا ہوا شیشہ بھی وُہیں لگا دیا تا کہ دیکھنے والے کو پتا ہی نہ چل سکے۔"

"مگر ابھی ابھی تو پولیس ساری کھڑکیاں دیکھ کر گئی ہے۔" بیرسٹر صاحب حیرت سے بولے۔ "تم تو پولیس کے بھی اُستاد نِکلے۔ واہ میاں جیتے رہو۔"

ظہیر مُسکرایا اور کھڑکی کھول کر اندر کود آیا۔ شوکت اُچھل کر بولا۔ "ارے ظہیر! یہ۔۔۔ یہ ماچس کی جلی ہوئی تیلی کیسی پڑی ہے؟" ظہیر نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے تیلی چھِین لی اور غور سے دیکھنے لگا۔

"شوکت! یہ تیلی تم نے کہاں سے اُٹھائی؟ جلدی بولو۔" اُس نے پُوچھا۔

”ادھر سے۔ اسی الماری کے پاس سے شوکت نے جواب دیا۔

”آپ لوگ جہاں کھڑے ہیں، وہیں کھڑے رہیے۔ ظہیر بولا۔ ”جب تک میں نہ کہوں، اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔“

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر غور سے فرش کو دیکھنے لگا اور جب تجوری کے پاس پہنچا تو ایک دم چونک پڑا۔ فرش پر موم بتّی کا پگھلا ہوا موم پڑا تھا۔

”آہا! تو یہ بات ہے۔“ وہ موم اُٹھا کر بولا۔ ”چور نے ڈر کے مارے بجلی نہیں جلائی۔ وہ اپنے ساتھ موم بتّی اور ماچس لیتا آیا تھا۔ یہ اُسی کی تیلی اور پگھلا ہوا موم ہے۔ ہاہا!“

”کیوں، کیا بات ہے رحمان؟“

دروازے میں رحمان کھڑا تھا۔ ”ج۔ جناب! کھانا کِس وقت تناول فرمائیں گے؟“ اُس نے ہچکچاتے ہوئے بیرسٹر صاحب سے پوچھا۔ لہجے سے معلُوم ہوتا تھا جیسے بہت گھبرایا ہوا ہے۔

بیرسٹر صاحب نے ظہیر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''چلیے۔ میرا کام ختم ہو چُکا۔ کمرہ میں اب کوئی چیز نہیں جسے دیکھا جائے۔''

تینوں جا کر کھانے کے کمرے میں بیٹھ گئے اور جب رحمان میز پر کھانا چُننے لگا تو ظہیر مُسکرا کر بولا۔ ''بیرسٹر صاحب! آپ بالکل بے فکر رہیے۔ چور میری مُٹھّی میں ہے۔ میں خُوب جانتا ہوں کہ چوری کس نے کی ہے اور اُس نے آپ کی چیزیں کہاں چھپا رکھی ہیں۔'' یہ کہہ کر اُس نے رحمان کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر فوراً ہی وہ سنبھل گیا اور بولا۔ ''سچ مُچ۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ اُسے گرفتار کیوں نہیں کرا دیتے؟''

''ابھی اس کا موقع نہیں۔'' ظہیر نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ٹھہرو اور کل تک اِنتظار کرو۔'' ''خدا کرے کہ آپ کامیاب ہوں۔'' رحمان آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھ کر بولا اور کمرے سے باہر نِکل گیا۔

''بھئی! ایمان کی بات ہے۔ میری سمجھ میں تو کُچھ آیا نہیں۔'' بیرسٹر صاحب پلاؤ کا نوالہ حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے بولے۔

”صبر کیجیے۔“ ظہیر بولا۔ ”خُدا نے چاہا تو صُبح تک سارا مُعاملہ صاف ہو جائے گا۔“

”تمہارے مُنہ میں گھی شکر۔“ انہوں نے مُسکرا کر کہا۔ ”یہ قورمے کی پلیٹ اُٹھاؤ۔ ہاں ہاں! تکلّف نہ کرو۔ اپنا گھر ہے اور تم بھی میاں شوکت! لو یہ کباب دیکھو۔ خالص گھی میں تلے ہوئے ہیں۔“

”شُکریہ شُکریہ!“ ظہیر نے کہا۔ ”ہاں! اگر آپ اجازت دیں تم میں آج کی رات یہیں ٹھہر جاؤں۔“

”لو بھئی! اس میں اجازت کی کون سی بات ہے۔“ بیرسٹر صاحب بولے۔ ”سر آنکھوں پر۔ جس کمرے میں چاہو آرام کر سکتے ہو۔ میں رحمان کو ہدایت کر دوں گا۔ وہ تمہارے آرام کا پورا خیال رکھّے گا۔“

کھانے کے بعد تھوڑی دیر اِدھر اُدھر باتیں ہوتی رہی اور پھر بیرسٹر صاضب اُٹھ کر زنانے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد رحمان، ظہیر اور شوکت کو بھی ان کے کمروں میں چھوڑ آیا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دیں۔ میں باورچی خانے میں ہوں۔“ اُس نے ادب سے کہا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس کے

جانے کے بعد ظہیر دروازے کے پاس پہنچا۔ کُچھ سُن گُن لی اور پھر آہستہ سے کواڑ کھول کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

دوسرے دِن صُبح سویرے ہی ظہیر اُٹھ بیٹھا اور رحمان کے کمرہ پر جا کر زور سے دستک دے کر بولا۔ "رحمان۔ رحمان۔" رحمان نے آ کر دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ "آپ؟ اس وقت؟ کیا بات ہے؟"

"میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔" ظہیر نے آہستہ سے جواب دیا اور اندر گھُس گیا۔ رحمن کا مُنہ فق ہو گیا۔ بدن کانپ اُٹھا۔ گھبرا کر بولا۔ "کہیے کیسی باتیں؟"

"سُنو!" ظہیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "اب بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ چوری کس نے کی ہے؟"

رحمان لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "اف خُدایا! تو کیا آپ کو پتہ چل گیا؟ سب کُچھ بتایئے! بتایئے! کون ہے چور؟"

"تم اور کون؟" ظہیر تراخ کر بولا۔ "یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ چوری کسی گھر کے آدمی ہی نے کی ہے۔ مگر اس کا ثبوت کہ چور کون ہے، کل شام مُجھے ملا۔ اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو تو فوراً! سچ سچ بتا دو ورنہ پولیس کا ڈنڈا تمہاری زبان خود بخود کھُلوا دے گا۔ کیا تُم سُن رہے ہو؟"

"یہ غلط ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔" رحمان نے بچاؤ کی آخری کوشش کی۔ "میں بے گناہ ہوں۔"

"غلط نہیں۔ میرے پاس ثبوت موجود ہے۔" ظہیر نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ آری جس سے تم نے کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر چٹخنی کھولی۔ یہ آدھی جلی ہوئی موم بتّی جس کی روشنی میں تم نے تجوری توڑ کر زیورات نکالے بتاؤ۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ خیریت چاہتے ہو تو چوری کا سارا سامان میرے حوالے کر دو ورنہ ابھی جا کر پولیس کو خبر کرتا ہوں۔"

"پولیس؟ جیل خانہ؟" رحمان کا رؤاں رؤاں کانپ اُٹھا اور وُہ ظہیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "رحم! رحم! خدا کے لیے مُجھ پر رحم کیجئے۔ واقعی میں نے ہی لالچ سے

اندھا ہو کر یہ حرکت کی تھی۔ میں آپ کو سارا مال دیے دیتا ہوں۔ لیکن مُجھے پولیس سے بچا لیجئے۔"

ظہیر بولا۔ "تو جلدی کرو۔ چلو۔ کہاں رکھا ہے وہ مال؟"

رحمان نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے ایک ٹوٹا ہو صندُوق سرکایا اور اس کے نیچے سے زیورات وغیرہ نکال کر رکھ دیے۔

"انہیں اٹھا کر میرے ساتھ چلو۔ اُٹھو!" ظہیر نے حکم دیا اور رحمان فرماں بردار غلام کی طرح سر جھُکا کر اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

بیرسٹر صاحب برآمدے میں کھڑے نوکروں کو آوازیں دے رہے تھے۔ ظہیر مُسکرا کر بولا۔ "یہ لیجئے بیرسٹر صاحب آپ کا مال یہ رہا اور یہ رہا آپ کا چور۔ خُوب غور سے دیکھ لیجئے۔"

بیرسٹر صاحب تعجّب سے بولے۔ "چور۔۔۔۔ رحمان؟ میرے اللہ! یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ اُف!"

رحمان ہاتھ جوڑے کانپ رہا تھا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد جب بیرسٹر صاحب کا تعجّب دور ہوا تو ظہیر سے کہا۔ ”چلو اندر چلیں۔ وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔“

بیرسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے بولے۔ ”لیکن بھیّا ظہیر! تمہیں اِن پر شُبہ کیونکر ہوا؟ ذرا پورا قصّہ مجھے سُناؤ۔“

”بات معمولی ہے۔“ ظہیر ہنس کر بے پروائی سے بولا۔ ”آپ کو یاد ہو گا کل سہ پہر کے وقت جب آپ مُجھ سے باتیں کر رہے تھے تو میں اُٹھ کر دروازے کے پاس چلا گیا تھا اور باہر جھانکنے لگا تھا۔ دراصل مُجھے کسی کی آہٹ سُنائی دی تھی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو میرا شُبہ صحیح نکلا۔ یہی میاں رحمان دروازے سے کان لگائے ہماری باتیں سُن رہے تھے۔ یہ واقعہ گو دیکھنے میں معمولی تھا، مگر اصل میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس سے مجھے رحمان پہ شک ہوا اور میں اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنے لگا۔ اس کے ذرا بعد ہی کمرے میں جلی ہوئی ماچس کی تیلی اور موم بتّی کا گِرا ہوا موم مِلا۔ یہ واقعہ بھی آپ معمولی سمجھ رہے ہوں گے مگر جیسا

کہ آگے چل کر معلوم ہو گا، میرے لیے خاصہ اہم تھا۔ کل شام جب رحمان مُجھے کمرے میں چھوڑ کر باورچی خانے میں کھانا کھانے چلا گیا تو میں کمرے سے چُپ چاپ نِکلا اور اُس کے کمرہ کی تلاشی لینے لگا۔ تلاشی کے دوران مجھے میز پر پڑی ہوئی ایک آدھی موم بتّی مِلی۔ اس سے مُجھے اور شک ہوا اور میں زیادہ سرگرمی سے چھان بین کرنے لگا۔ الماری کھول کر دیکھی تو اُس میں ایک چھوٹی سی آری رکھی تھی جس سے شیشہ کاٹا جاتا ہے۔ یہ دیکھئے۔ میں ابھی تلاش و جستجو کر ہی رہا تھا کہ رحمان کی آہٹ سُنائی دی اور میں جلدی سے کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔" یہ کہہ کر اُس نے رحمان کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر بولا۔ "اس میں شک نہیں کہ رحمان نے چوری کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا مگر پھر بھی اناڑی پن کر ہی گیا۔ میرے خیال میں دو تین دن گزر جاتے تو پھر آپ کا مال مشکل سے ہی ہاتھ آیا۔"

"او ملعون! مُجھے خبر نہ تھی کہ تو آستین کا سانپ ثابت ہو گا۔" بیرسٹر صاحب طیش میں آکر بولے۔ "دیکھتا جا تیری وہ گت بناؤں گا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔

کریم! پولیس کو ٹیلیفون کرو کہ چور پکڑا گیا ہے۔ فوراً آ کر گرفتار کر لیں۔"

دن دہاڑے چوری

”تو میں نے کہا جناب جاسوس صاحب!“

شوکت کُرسی پر پیر پھیلا کر بولا۔ ”کل یونیورسٹی میں مشاعرہ ہے۔ چلو گے؟ اماں یار کیا ہر وقت سوچتے رہتے ہو۔ توبہ! تم جیسے چپڑ قناتیوں سے تو خدا بچائے۔“

”کیا کہا تم نے؟“ ظہیر نے چونک کر پوچھا۔ ”مشاعرہ! بھئی! مُجھے تو مشاعرے میں مزا آتا نہیں۔ اس لیے میرا جانا بے کار ہے۔ تم چلے جانا۔“

”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ شوکت گردن مٹکا کر بولا۔ ”ارے ہم جائیں تم نہ جاؤ۔ خُدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔ (زور سے) کبھی نہیں۔ تمہیں چلنا پڑے گا ورنہ میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا اور میرا خُون تمہاری گردن پر ہو گا۔“

ظہیر ہنس پڑا اور اُٹھ کر بولا۔ ”طبیعت بے چین سی ہے۔ آؤ ذرا شملہ پہاڑی تک گھُوم آئیں۔ اُٹھو بھی اب۔“

دونوں اُٹھ کر دروازے پر آئے اور نیچے اُترے ہی تھے کہ ایک شخص سائیکل دوڑاتا ہوا اُن کے پاس آیا۔ چہرے سے معلُوم ہوتا تھا جیسے بہت دُور سے آ رہا ہے۔

"کیوں صاحب! یہ۔ یہ کپتان رشید صاحب کا مکان کون سا ہے؟" اس نے ہانپتے ہوئے پُوچھا۔

"یہی ہے۔" ظہیر نے جواب دیا۔ "مگر وہ تو اس وقت باہر گئے ہوئے ہیں۔ کیا کچھ ضروری کام ہے؟"

"اے صاحب!" ان سے تو کام نہیں۔" نوکر لمبی لمبی سانسیں لے کر بولا۔ "اُن کے صاحب زادے، کیا نام، ہاں یاد آیا ظہیر صاحب سے کام ہے۔ اگر وہ اس وقت مِل جائیں تو بہت ہی اچھّا ہو۔"

"میرا ہی نام ظہیر ہے۔" ظہیر نے تعجّب سے کہا۔ "بتایئے کیا کام ہے؟"

"ارے صاحب کیا بتاؤں۔" وہ ماتھے سے پسینہ پونچھ کر بولا۔ "میں خان بہادر

رضی الدّین صاحب کا ملازم ہوں۔ انہوں نے آپ کو بُلایا ہے۔ خان بہادر صاحب اس وقت بڑی مُشکل میں گرفتار ہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے اُن کی کوٹھی پر تشریف لے چلیں۔ چوری کا معاملہ ہے۔ فرمایئے تانگہ لاؤں؟"

"تانگہ لانے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس سائیکل ہے۔" ظہیر نے کہا اور جلدی سے سائیکل نکال لایا۔

شوکت بولا۔ "کہو تو میں بھی چلُوں۔ مجُھے ذرا کام تھا۔" ظہیر نے کہا۔ "نہیں رہنے دو۔ کام ہے تو مت جاؤ۔" یہ کہہ کر سائیکل پر سوار ہو گیا اور نوکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

خان بہادُر رضی الدّین کی کوٹھی کوئینز روڈ پر تھی۔ خان بہادر صاحب پھانک کے پاس بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ظہیر کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور خُوش ہو کر بولے۔ "کیا تم ہی ظہیر ہو؟ میں نے اخباروں میں اکثر تمہارا ذکر پڑھا ہے۔ اس لیے سوچا کہ پولیس میں رپورٹ کرنے سے پہلے سے مشورہ کر لُوں۔ مجُھے اُمّید

ہے کہ تُم میری مدد کروگے۔ آؤ اندر چلیں۔ میں تمہیں پورا قِصّہ سناؤں گا۔"

مُلاقاتی کمرے میں پہنچ کر دونوں صوفے پر بیٹھ گئے تو خان بہادُر صاحب بولے۔
"تم نے نوکر کی زبانی تھوڑا بہُت واقعہ تو سُن لیا ہو گا۔ دراصل آج میری کوٹھی میں چوری ہو گئی اور چوری بھی دن دہاڑے یعنی ابھی ابھی۔ ایک گھنٹہ ہوا کہ کوئی کم بخت مُجھے لوٹ کر لے گیا۔"

"آپ کہیں باہر گئے ہوئے تھے؟" ظہیر نے سوال کیا۔

"ہاں میں باہر گیا ہوا تھا۔" خان بہادر صاحب نے جواب دیا۔

"آپ کے پیچھے کوٹھی میں کون کون موجُود تھا؟" ظہیر نئے دِل چسپی لیتے ہوئے پُوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔" انہوں نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ پچھلے تین دِنوں سے کوٹھی کی مرمّت ہو رہی ہے۔ میں نے اپنے بیوی بچّوں کو سُسرال بھیج دیا ہے تا کہ انہیں پریشانی نہ ہو۔ نوکروں کو بھی تین دن کی چھٹیاں دے دی ہیں۔ چونکہ

یہاں کھانے کا کوئی بندوبست نہیں۔ اس لیے میں کھانا کھانے ہوٹل جاتا ہُوں۔ چنانچہ آج بھی بارہ بجے کے قریب مزدور کام کاج ختم کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو میں کمرے وغیرہ بند کر کے ہوٹل چلا گیا۔ پون گھنٹے بعد واپس آیا تو معلُوم ہوا کہ۔۔۔۔۔"

"میں سمجھ گیا۔" ظہیر بات کاٹ کر بولا۔ "کِس کمرے میں چوری ہوئی؟"

"میری بیوی کے کمرے میں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "زیور الماری میں رکھّے تھے۔ میں کِسی کام سے اندر گیا تو الماری کھُلی پڑی تھی اور تمام زیورات غائب تھے۔"

"چلیے! میں اس کمرے کو ذرا دیکھنا چاہتا ہوں۔" ظہیر اُٹھتے ہوئے بولا۔

خان بہادر صاحب بولے۔ "آیئے اس طرف آیئے۔"

دو چار کمروں کو عبور کر کے وہ ایک سجے ہوئے کمرے میں پُہنچے جو دوسرے کمروں کی نسبت ذرا آراستہ پیراستہ تھا۔ یہ کمرہ سب سے آخر میں تھا۔ اس لیے

اُس کی کھڑکیاں باہر کھُلتی تھیں۔ ظہیر نے غور سے ایک ایک کھڑکی کو دیکھا اور آخری کھڑکی کے پاس جا کر ٹھٹک گیا۔ چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔

"ہوٹل جانے سے قبل آپ نے اس کمرے کو خُوب احتیاط سے بند کیا تھا؟" اُس نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔" خان بہادر صاحب بولے۔ "میں نے اسے بند کر کے تالا لگا دیا تھا اور کھڑکیاں بھی ساری بند تھیں۔"

"لیکن شاید آپ نے کھڑکیوں کو غور سے نہیں دیکھا۔" ظہیر نے کہا۔ "یہ دیکھیے اس کھڑکی کی چٹخنی کھُلی ہوئی ہے۔ معلُوم ہوتا ہے آپ یا آپ کی بیوی چٹخنی لگانی بھُول گئے تھے۔ چور اس کے راستے اندر داخل ہوا۔"

اُس نے آہستہ سے کھڑکی کھول کر باہر کی طرف جھانکا اور پھر سر ہلا کر بولا۔ "ہُوں۔ بالکل ٹھیک۔ خیر یہ تو ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ چوری کس نے کی اور چور اس وقت کہاں ہے۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" خان بہادُر صاحب بولے۔ مُجھے اُمّید ہے کہ تم چور کا پتا لگانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ آہ! میری بیوی کو جب یہ معلُوم ہو گا کہ اُس کے سارے زیورات چوری ہو گئے ہیں تو اُسے کتنا دُکھ ہو گا۔ افسوس یہ سب میرا ہی کیا کرایا ہے۔ نہ میں اُسے میکے بھیجتا نہ گھر خالی ہوتا اور نہ چوری ہوتی۔ لیکن خیر سانپ تو نکل چکا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ! قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میاں ظہیر! تم نے بہت سی چوریوں کے کھوج لگائے ہیں۔ اگر تم نے میرے کھوئے ہوئے زیورات واپس دلا دیے تو میں تمھیں نہال کر دوں گا۔"

"مُعاف فرمایئے۔" ظہیر مُسکرا کر بولا۔ "میں کسی کا کام لالچ کی وجہ سے نہیں کرتا۔ مُجھے جاسوسی اور سراغ رسائی سے عشق ہے۔ خیر چھوڑیے اِن باتوں کو۔ یہ فرمایئے کہ یہ آپ کا نوکر جو مُجھے بُلانے گیا تھا، آپ کے پیچھے کہاں تھا؟"

"اپنے گھر۔" انھوں نے کہا۔ "یہ نوکر جس کا نام عبدالرّحمٰن ہے، دوسرے نوکروں کے ساتھ چھُٹّی پر گیا ہوا تھا۔ ابھی آدھ گھنٹے ہوا کہ واپس آیا ہے۔ لیکن اس پر شک کرنا بے کار ہے۔"

”اپنی رائے کا اظہار نہ کیجیے۔“ ظہیر نے مُسکرا کر کہا۔ ”جو میں پُوچھوں صرف اُس کا جواب دیجیے۔“

خان بہادُر صاحب خاموش ہو کر ایک کُرسی پر بیٹھ گئے اور ظہیر کمرے میں گھُوم پھر کر چیزوں کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ الماریاں، میز، کُرسیاں، بکس، درازیں، کھڑکیاں، فرش غرض کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کو اس نے غور سے دیکھا۔ خان بہادُر صاحب نے کئی مرتبہ بولنے کی کوشش کی مگر اُس نے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ جانچ پڑتال مکمّل ہو گئی تو وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور سر کھُجلاتے ہوئے بولا۔ ”مُعاملہ کُچھ ایسا اُلجھا ہوا نہیں۔ چوری کرتے وقت چور بہت جلدی میں تھا۔ گھبراہٹ میں وہ اپنے پیچھے کئی ایک نشان چھوڑ گیا ہے۔ مزدور کام ختم کر کے کِس وقت گئے تھے؟“

”بارہ بجے۔“ خان بہادُر صاحب نے جواب دیا۔ ”میں نے خُود ان کا حساب کر کے کوٹھی سے رُخصت کیا تھا اور جب تک وہ یہاں کام کرتے رہے تھے، میں برابر اُن کے پاس ہی کھڑا رہا۔“

"اور اب کوٹھی کے اندر کوئی مزدور موجود تو نہیں ہو گا؟" ظہیر نے پُوچھا۔

"جی نہیں! مگر ٹھہریے!" وُہ کُچھ یاد کر کے بولے۔ "ایک مزدور ابھی ہے۔ مگر وُہ باغیچے کے پرے نوکروں کے کمرے میں سفیدی کر رہا ہے۔ ہوٹل جاتے وقت اُس نے مُجھے بتایا تھا کہ میرا کام ۳ بجے ختم ہو گا کیونکہ وہ نوکروں کے کمرے میں تھا، اس لیے میں اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" ظہیر بولا۔ "تو وہ مزدور ابھی وہیں ہو گا۔ چلیے ذرا اس سے بھی مل لیں۔ مُمکن ہے اُس نے کسی کو آتے جاتے دیکھا ہو۔"

"خیال تو ٹھیک ہے۔" خان بہادُر صاحب چونک کر بولے۔ "چلیے وہ سامنے نوکروں کے کوارٹر ہیں۔"

کواٹروں کے قریب پُہنچ کر خان بہادُر صاحب اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے۔ "ارے وُہ مزدور کیا نام اس کا رحمت باہر تو دِکھائی دیتا نہیں۔ شاید اندر ہو مگر دروازے تو سارے بند ہیں۔ یہ معاملہ کیا ہے؟"

ظہیر ایک کمرے کی طرف بڑھا مگر ابھی دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ کسی نے اندر سے دروازہ کھٹ کھٹا کر زور سے کہا۔ "کھولو۔ کھولو۔ یہ کون کم بخت مُجھے بند کر گیا؟"

"ایں! یہ تو رحمت کی آواز ہے۔" خان بہادُر صاحب حیرت سے بولے۔ "کھولیے تو اسے کِس نے بند کر دیا؟"

ظہیر نے آگے بڑھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ اندر رحمت بُت بنا کھڑا تھا۔

تھوڑی دیر وُہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر خان بہادُر صاحب بولے۔

"ارے رحمت! تو اندر کیسے بند ہو گیا؟"

"مُجھے خُود معلُوم نہیں صاحب!" اُس نے جواب دیا۔ ایک گھنٹہ ہوا میں اندر سفیدی کر رہا تھا کہ کسی نے ایک دم دروازہ بند کر کے کُنڈی لگا دی۔ میں سمجھا کسی مزدور نے مذاق کیا ہو گا۔ مگر ایک گھنٹہ گُزرنے کے بعد بھی کسی نے نہیں کھولا تو میں بہت پریشان ہوا۔ بہت دیر سے برابر چیخ رہا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔" خان بہادُر صاحب نرمی سے بولے۔ "دور ہونے کی وجہ سے تمہاری آواز مُجھ تک نہ پہنچ سکی۔ کہو کام ختم ہو گیا؟"

"جی ہاں! صرف ذرا سا رہ گیا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "آدھ گھنٹے میں وہ بھی ہو جائے گا۔"

"خیر چلو کام کرو۔ جاتے وقت اپنا حساب کرتے جانا۔" خان بہادُر صاحب نے کہا اور ظہیر کو اِشارہ کیا کہ وہ رحمت سے کُچھ پُوچھے۔ لیکن ظہیر اُن کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "چلیے واپس چلیں۔ آیئے تو۔" راستے بھر نہ تو خان بہادُر ہی کُچھ بولے اور نہ ظہیر۔ اور جب وہ کمرے میں جا کر بیٹھ گئے تو ظہیر نے کہا۔ "رحمت کو

بُلوائیے۔ میں اُس سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ "

"تم نے اُس سے وہیں کیوں نہ پُوچھ لیے۔" وہ حیرت سے بولے۔ "اور پھر وہ غریب تو چوری کے وقت کمرے میں بند پڑا تھا۔ وُہ بتا بھی کیا سکتا ہے؟"

ظہیر کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ قدرے تیز لہجے میں بولا۔ "جو میں کہوں وہ کیجیے گا۔ نوکر سے کہیے کہ رحمت کو بُلا لائے۔"

خان بہادُر صاحب نے اُٹھ کر بے دلی سے گھنٹی بجائی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور رحمت اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کا فکر پریشانی کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ "آپ نے مجُھے بُلایا ہے؟" اُس نے اندر آکر پُوچھا۔

"ہاں!" ظہیر اُسے سر سے پیر تک دیکھ کر بولا۔ "آج اس کوٹھی میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس کمرے سے خان بہادُر صاحب کی بیوی کے زیورات چوری ہو گئے۔"

رحمت کے مُنہ سے حیرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ گھبرا کر بولا۔ ’’کب؟‘‘

’’ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے کی بات ہے۔‘‘ ظہیر نے جواب دیا اور پھر خان صاحب کی طرف مُڑ کے بولا۔ ’’آپ اسے سارا قصّہ سُنائیے۔ میں ابھی حاضر ہوا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

’’بات یہ ہے بھئی رحمت۔‘‘ خان بہادُر صاحب بولے۔ ’’بارہ بجے کے قریب میں ہوٹل میں کھانا کھانے چلا گیا تھا۔ واپس آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ اس کمرے سے کوئی نامراد زیور اُڑا کر چمپت ہو گیا ہے۔‘‘

’’ارے!‘‘ رحمت آہستہ سے بولا۔ ’’یہ تو چور ہی تھا، جس نے مُجھے بند کر دیا۔ آپ پولیس کو بُلوائیے۔ ہو سکتا ہے کہ کِسی مزدور نے یہ حرکت کی ہو۔ کسی کا کیا اعتبار۔ زمانہ بڑا خراب خان بہادُر صاحب کُچھ کہنا چاہتے تھے کہ ظہیر چُپ چاپ دروازہ کھول کر اندر آ گیا اور مُسکرا کر بولا۔ ’’مٹھائی کھلوائیے جناب! آپ کا چور پکڑا گیا۔‘‘

’’کہاں ہے وہ؟ مُجھے بتاؤ۔ بولو۔‘‘ خان بہادُر صاحب جوش سے چیخ کر بولے۔

"آپ کے سامنے کھڑا ہے۔" ظہیر رحمت کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

رحمت چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور غصّے سے بولا۔ "م۔۔۔م۔۔۔میں چور؟ دیکھیے صاحب ہم غریبوں کی بھی عزّت ہوتی ہے۔ آپ کو شرم نہیں آتی میرے اوپر الزام لگاتے؟ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"میرے پاس کئی ایک ثبوت ہیں۔" ظہیر ہنس کر بولا۔ "سب سے پہلے میں تمہاری ہوشیاری کی داد دیتا ہوں۔ تم نے ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش تو بُہت کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ٹھہرو میں پورا قصّہ سُناتا ہوں۔ جب خان بہادُر صاحب ہوٹل چلے گئے تو تم میدان صاف دیکھ کر اپنے کمرے سے نکلے اور تمام کمروں کو دیکھ تاڑتے ہوئے اس کمرے میں کھڑکی کے راستے داخل ہوئے اور یہاں سے زیورات چُرا کر پھر اپنی جگہ چلے گئے۔ لیکن چُونکہ تُم نئے نئے چور جو ٹھہرے، اس لیے غلطی سے اپنے پیچھے چند نشان بھی چھوڑتے گئے جنہیں دیکھ کر مُجھے تم پر تعجّب ہوا۔"

"لیکن میں تو کمرے میں بند پڑا تھا۔ آپ نے جا کر مُجھے نِکالا۔" رحمت لُقمہ دے

کر بولا۔

"سُتنے جایئے۔" ظہیر نے نرمی سے کہا۔ "چوری کرنے کے بعد تم نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تم پر شک کرے۔ اس لئے تم نے یہ چالاکی کی کہ نوکر کے کمرے کا دروازہ بند کر کے کُنڈی چڑھا دی اور خود کھڑکی کے راستے اندر گھُس کر بیٹھ گئے۔ واہ بھئی واہ! کیا عقل پائی ہے۔ تُم دوسروں کو بھی اپنی ہی طرح احمق سمجھتے ہو؟ مَیں تُم سے پُوچھتا ہوں کہ کوئی تمہیں اندر بند کر جاتا تو تم کھڑکی کے راستے باہر نہیں آسکتے تھے؟ ایسا تُم نے صرف اس لیے کیا کہ خان بہادر صاحب تمہیں اندر بند دیکھ کر تمہارے اوپر شک نہ کریں۔ واہ میرے دوست واہ! جِیتے رہو۔ تیسرا اور سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔" ظہیر نے جیب سے زیورات نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی میں تمہارے کمرے کی تلاشی لے کر آیا ہوں۔ یہ زیورات تمہارے کپڑوں میں لپیٹے رکھے تھے۔"

رحمت بے تحاشا دروازہ کی طرف بھاگا مگر خان بہادُر صاحب نے اُسے پکڑ لیا اور دو چار مکّوں میں زمین پر گرا دیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس نے آ کر رحمت کو گرفتار کر لیا اور تھانے لے گئی۔ خان بہادر صاحب ظہیر کا ہاتھ دبا کر بولے۔ "تم کتنے ذہین، عقل مند اور ہوشیار ہو۔ میاں تُم بڑے ہو کر تو خُدا جانے کیا غضب ڈھاؤ گے۔ پیسے ویسے تو تم لو گے نہیں۔ یہ تو مُجھے خُوب معلوم ہے مگر تمہارا ایسے جانا بھی اچھا نہیں۔ اس لیے ایک ہفتے تک تم میرے ہاں مہمان رہو گے۔ میں ابھی تمہارے گھر اِطّلاع کرائے دیتا ہوں

اور اپنے بیوی بچّوں کو بھی بُلائے لیتا ہُوں۔ وہ بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ عبدالرحمان ! چائے لے کر آؤ۔ بیٹھو میاں! ریڈیو کھول دُوں؟ کون سا اسٹیشن سُنو گے۔ لاہور کہ پشاور؟“

کٹی ہُوئی اُنگلی

”کل تمہارے ابّا جان کہہ رہے تھے۔“ امّی جان ظہیر کے پاس بیٹھی ہوئی بولیں۔ ”کہ ظہیر کی اس عُمر میں یہ حالت ہے۔ بڑا ہو کر نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ بیٹا! شہر کے بچّے بچّے کی زبان پہ تیرا ہی چرچا ہے۔ کل میں نعیمہ کی شادی میں گئی تو وہاں عورتوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں اسی ظہیر کی ماں ہوں، جس نے ایسے ایسے کارنامے کئے ہیں تو سب مجھے گھیر کر بیٹھ گئیں اور تیرے متعلّق پوچھنے لگیں۔ بعض تو سر ہو گئیں کہ ہمیں کسی صُورت سے اپنے بیٹے کو دِکھاؤ۔“

”تھوڑی سی چائے اور دیجیے۔“ ظہیر بسکٹ چباتے ہوئے بولا۔ ”شوکت ابھی تک نہیں آیا۔ ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ میں تو جاتا ہوں۔ آئے تو کہہ دینا تمہارا انتظار کرتے کرتے اسکول چلا گیا۔“

وہ ابھی پوری بات بھی نہ کہنے پایا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھُلا اور شوکت ہانپتا ہوا اندر داخل ہُوا۔۔۔ خلافِ معمول اُسے پریشان حالت میں دیکھ کر ظہیر بھونچکا

رہ گیا اور گھبرا کر بولا۔ ”ارے شوکت! خیریت تو ہے؟ کتابیں کہاں ہیں اور یہ تمہاری صُورت سے وحشت کیوں ٹپک رہی ہے۔ ارے خُدا کے بندے کُچھ بول تو سہی کسی سے لڑائی ہو گئی؟ کوئی حادثہ ہو گیا؟“

”ارے کہوں کیا؟“ شوکت بیٹھے ہوئے بولا۔ ”اوسان صحیح ہوں تو کُچھ کہوں بھی۔ ہائے کیا خبر تھی کہ اَیسا ہو جائے گا۔ یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔ ہائے میرے چچا (زور سے) چچا جان! تم کہاں ہو؟“ ”ایں تو کیا ڈاکٹر صاحب کا اِنتقال ہو گیا؟“ ظہیر نے پُوچھا۔ ”اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ یہ تو تم نے بُری خبر سنائی۔“

”اررر۔“ شوکت دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر بولا۔ ”ایسا مت کہو۔ چچا جان اِنتقال کر جائیں گے تو پھر مجھے پیسے کون دیا کرے گا؟ ہائے ایک اور ہی بات ہو گئی ہے۔ وہی جاسوسی والی بات! ہائے۔“

”دیکھ بھئی۔“ ظہیر غصّے میں آ کر بولا۔ ”صاف صاف بتا دے کہ کیا معاملہ ہے ورنہ۔۔۔۔!“

”بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔“ وہ میز پر رکھّی ہوئی چائے اور بِسکٹوں کو للچائی ہوئی

نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ بسکٹ کہاں سے خریدے تھے؟ میں نے کہا ہے ہمیشہ بٹ کی دُکان سے خریدا کرو۔ وہ میرا دوست ہے۔“

ظہیر کی امّی ہنس کر بولیں۔ ”ابھی تو تُو ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہا تھا اور ابھی اچھا خاصا ہو گیا۔ تو آدمی ہے کہ بھُوت؟ توبہ ایسا آدمی بھی کیا۔۔۔!“

”ارے لاحول ولا۔ وہ تو میں بھُول ہی گیا۔“

وہ ظہیر کی طرف مُنہ کر کے بولا۔ ”تمہیں سُن کر افسوس ہو گا کہ میرے چچا یعنی ڈاکٹر نذیر حسین صاحب جنہوں نے پچھلے دنوں میں کونین کے بدلے ٹنکچر ایوڈین پلا دیا تھا، کو کل رات کوئی لُوٹ کر لے گیا۔ بے چارے نے دس سال کی محنت سے کچھ مال متاع جمع کیا تھا اور وہ چور چُرا کر لے گئے۔

”آج صُبح میں اُن کے گھر گیا تو وہاں ایک حشر برپا تھا۔ پولیس دوڑ دھُوپ کرتی پھر رہی تھی اور چچا جان کی جو حالت تھی، اُسے دیکھ کر پہلے تو میری ہنسی نکل گئی اور پھر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ قصّہ مُختصر یہ کہ اب تم فوراً میرے ساتھ چلو۔ میں اُن سے کہہ کر آیا ہوں کہ ظہیر کو لے کر ابھی آتا ہوں۔۔۔ چلو اُٹھو۔“

ظہیر بولا۔ ”لیکن کہیں تُو مذاق تو نہیں کر رہا؟ تیرا اعتبار بھی کیا؟ جھوٹا کہیں کا!“

”مذاق؟ بڑے افسوس کی بات ہے!“ وہ بناوٹی غصّے سے بولا۔ ”یہاں جان پر بن رہی ہے اور تمھیں دل لگی سُوجھ رہی ہے۔ خُدا قسم! حرام ہے جو صُبح سے سوائے دو پیالی چائے اور تین پراٹھوں کے کچھ کھایا پیا ہو۔ چلو چچا جان تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ پورا واقعہ وہ ہی تمھیں سُنائیں گے۔ میرے تو حواس بجا نہیں۔“

”امّی جان! میری آج کی رُخصت کی درخواست بھیج دینا۔“ ظہیر اُٹھ کر بولا۔ ”میں شوکت کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

ڈاکٹر صاحب دروازے پر کھڑے اُن کا اِنتظار ہی کر رہے تھے۔ ظہیر کو دیکھ کر دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھے اور زور سے بولے۔ ”کیا یہی وہ ظہیر ہیں جنہوں نے بہت سی چوریوں کا پتا چلایا ہے۔ خوش آمدید! مرحبا! اب مُجھے پورا یقین ہے کہ میرا مال مُجھے ضرور واپس مل جائے گا۔ آؤ بیٹھک میں چل کر بیٹھیں۔“

کُرسی پر بیٹھ کر ظہیر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”ابھی ابھی مجھے شوکت کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کے ہاں چوری ہو گئی ہے۔ مُجھے یہ سُن کر بہت

افسوس ہوا۔"

"چوری سی چوری!" میاں ڈاکٹر صاحب سرد آہ بھر کر بولے۔ "میرا تو دیوالہ ہی نکل گیا۔ دو قیمتی قالین، چاندی کے سارے برتن اور قریباً دس ہزار روپیہ جو میں آج بنک میں جمع کرنے والا تھا۔ ہائے اللہ!"

"خاطر جمع رکھیے خُدا کارساز ہے۔ ظہیر ڈھارس بندھاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کسی پر شُبہ تو نہیں؟"

"شُبہ؟ ارے میاں! کِس پر شُبہ کروں؟" اُنہوں نے جواب دیا۔ "محلے بھر میں کوئی ایسا لُچّا لفنگا یا غُنڈہ نہیں، جس پر شُبہ کیا جا سکے۔ پولیس نوکروں کے بارے میں پُوچھتی تھی۔ گھر میں دو ہی تو نوکر ہیں۔ ایک مرد اور دوسری بوڑھی باورچن۔ سو باورچن تو ایک مہینے سے بیمار ہے اور لطیف ایک ہفتہ ہوا کہ اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ اب گھر میں یا تو ہم دونوں میاں بیوی ہیں یا اللہ کا نام۔"

"سونے سے قبل آپ نے گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا؟ سوچ کر بتایئے۔" ظہیر نے سوال کیا۔

”جی ہاں! مُجھے خوب یاد ہے کہ میں نے دروازہ بند کیا تھا۔“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ”دروازہ بند کر کے میں نے اندر بیوی سے باتیں کیں اور پھر پڑ کر سو گیا۔ رات بھر آرام سے سویا رہا کیوں کہ آج کل میں چہل قدمی زیادہ کرتا ہوں۔ اس لیے خُوب گہری نیند آتی ہے۔ صُبح کو دروازے پر دُودھ والے نے آواز دی اور میں باہر جو نِکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازہ چوپٹ کھُلا پڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“ ظہیر نے سر ہلایا۔ ”اس کے بعد آپ نے چھان بین کی تو پتا چلا کہ چوری ہو گئی اور پھر آپ نے تھانے میں جا کر رپٹ لکھوائی۔“

”بالکل۔ بالکل۔“ ڈاکٹر صاحب چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے بولے۔ ”تم نے میرے مُنہ کی بات چھین لی۔“

”اچھّا کل آپ کس وقت سوئے تھے؟“ ظہیر نے سوچ کر پُوچھا۔

”گیارہ بجنے میں کُچھ منٹ ہوں گے۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”یا گیارہ بج چکے ہوں گے۔ میرا روزانہ معمول ہے کہ شام کا کھانا کھا کر چہل قدمی کو نکل جاتا ہوں اور عموماً ۱۰ بجے گھر لوٹ آتا ہوں۔ مگر کل ذرا دیر ہو گئی۔“

"آپ تنہا ٹہلنے جاتے ہیں یا کوئی ساتھ بھی ہوتا ہے؟" ظہیر نے پُوچھا۔

"عام طور پر تو میں تنہا ہی جایا کرتا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "مگر کل حامد خاں بھی ساتھ گئے تھے۔"

"حامد خاں۔" ظہیر ذرا دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ کے کسی دوست کا نام ہے؟"

"نہیں جی!" انہوں نے مُنہ بنا کر جواب دیا۔ "یہ ایک شخص ہے جو کہتا ہے کہ میں چمڑے کا کاروبار کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو راولپنڈی کا بتاتا ہے۔ ایک مہینہ ہوا میرے پاس علاج کے لیے آیا تھا۔ تب سے جب بھی لاہور آتا ہے تو میری دُکان پر ضرور آتا ہے۔ صُورت سے شریف معلوم ہوتا ہے۔ کل راستے میں مِل گیا اور ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے جناح باغ تک چلے گئے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں گھومتے رہے۔ مگر لعنت بھیجو اس پر۔ کام کی بات کرو۔"

"ذرا ٹھہریئے۔" ظہیر ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "کیا آپ اس کے ساتھ ہی واپس آئے تھے؟"

”ہاں ڈاک خانہ تک ہم ساتھ ساتھ آئے تھے۔“ انھوں نے کہا۔ ”پھر وہ تو میکلوڈ روڈ کی طرف مُڑ گیا اور میں سیدھا گھر چلا آیا۔ جانے سے پہلے اُس نے بتایا تھا کہ میں کشمیر ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور آپ مُجھ سے وہیں آ کر ملیں۔ مگر خاک ڈالو اس پر میاں! ان باتوں کا چوری سے کیا تعلّق! تم مطلب کی باتیں پوچھو۔“

”یہ بھی مطلب کی باتیں ہی ہیں جناب!“ ظہیر ہنس کے بولا۔ ”آپ نہیں سمجھ سکتے اُنہیں معاف فرمایئے!“

”تو کیا تم سمجھتے ہو اس چمڑے کے بچّے نے میرے گھر چوری کی ہے؟ ہو ہو ہو آخ آخ۔“ ڈاکٹر صاحب قہقہہ مار کر بولے۔ ”یہ بھی خُوب رہی۔ ہو ہو ہو ہاہا۔ قہ قہ قہ۔“

ڈاکٹر صاحب ہنستے ہنستے دوہرے ہوئے جارہے تھے اور ظہیر بالوں میں اُنگلیاں پھرا کر کُچھ سوچ رہا تھا کہ کمرہ میں لگی ہوئی گھنٹی زور سے بجی۔

”شاید کوئی مریض آیا ہے؟“ ڈاکٹر صاحب اُٹھ کر بولے اور کھڑکی کھول کر نیچے جھانک کر زور سے بولے۔ ”آہ! آپ ہیں حامد خان صاحب! آیئے۔ اندر

تشریف لے آیئے۔ اِدھر دائیں طرف دروازہ ہے۔ بھلے وقت آئے۔"

"آہ ڈاکٹر صاحب۔" وہ گھُستے ہی بے تکلّفی سے بولا۔ "خُدا کا شکر ہے کہ آپ مِل گئے۔ دُکان بند دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ سوچا خُدا نہ کرے کُچھ طبیعت نہ خراب ہو گئی ہو۔ مزاج تو اچھّے ہیں؟"

"کیا خاک اچھّے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "ہاں یہ تو فرمایئے آپ کو میرے گھر کا پتا کیسے چلا؟"

"ہاہاہا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اماں ڈھونڈے سے تو خُدا بھی مل جاتا ہے۔ آپ تو پھر اِنسان ہیں۔ دراصل میں آج راولپنڈی جا رہا ہوں۔ سوچا جانے سے پہلے آپ سے مِلتا چلوں۔ خُدا جانے پھر کب ملاقات ہو۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اس تکلیف کا شکریہ! مگر ایں یہ آپ کی اُنگلی پر پٹّی کیسی بندھی ہے؟" ڈاکٹر صاحب اشارہ کر کے بولے۔

اس نے ہاتھ اُٹھا کر انگلی کو دیکھا اور بڑی بے پروائی سے بولا۔ "ایسے ہی معمولی

خراش آ گئی تھی، ٹھیک ہو جائے گی۔ اور فرمایئے۔ مزاج تو اچھّے ہیں نا؟"

"اجی کیسے مزاج اور کہاں کی طبیعت؟ "

ڈاکٹر صاحب افسردگی سے بولے۔ "کل ایک بڑا افسوسناک واقعہ ہوا ہے۔ آپ کو سُن کر ضرور افسوس ہو گا۔ رات کسی کم بخت نے مکان میں گھُس کر میرا سارا قیمتی سامان چُرا لیا۔"

""ارے سچ مُچ؟" وہ افسوسناک لہجے میں بولا۔ "چچ چچ چچ یہ تو آپ نے بُہت بُری خبر سُنائی۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ فرمایئے۔ اس سلسلے میں مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"سوائے ہمدردی کے اور آپ کر ہی کیا سکتے ہیں بھائی۔" ڈاکٹر صاحب کُرسی پر پیچھے جھک کر بولے۔ "دیکھو خُدا کیا کرتا ہے۔"

آدھ گھنٹہ تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر حامد خاں اُٹھ کر چلا گیا۔

"تو یہ ہیں حامد خاں؟" ظہیر ڈاکٹر صاحب کی طرف مُڑ کر بولا۔ "بہ ظاہر تو آدمی

شریف اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔"

"مگر تم تو اس کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی پرلے درجے کا بدمعاش ہو۔ ہاہا۔" ڈاکٹر صاحب ہنس کر بولے۔

ظہیر یہ سوچ کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "ابھی تک آپ نے وہ کمرہ تو دکھایا ہی نہیں جہاں سے سامان چوری ہوا ہے۔ چلیے ایک نظر اُسے بھی دیکھ لیں۔"

دو چار چھوٹے چھوٹے کمروں کو پار کر کے وہ ایک بڑے فراخ کمرہ میں پہنچے جو خوب آراستہ پیراستہ تھا۔ ایک طرف دو بڑی بڑی الماریاں رکھی تھیں اور دائیں طرف آتش دان کے پاس لوہے کا ایک صندوق پڑا تھا۔

"حیرت کی بات یہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب کمرے میں گھُس کر بولے۔ "اس کمرہ میں میری بیوی نے تالا ڈال دیا تھا۔ کھڑکیاں بھی ساری بند تھیں۔ دیکھ لو ابھی تک بند ہیں اور کُنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔"

"خیر یہ تو کوئی خاص بات نہیں۔" ظہیر نے جواب دیا۔ "چوروں کے پاس ہر

طرح کی کنجیاں موجود ہوتی ہیں۔“

”ان الماریوں میں برتن رکھے ہوئے تھے جنہیں میں خاص خاص دعوتوں میں استعمال کیا کرتا تھا اور اب خُدا جانے مُجھے نصیب بھی ہوں یا نہ۔ اور یہ فولادی صندوق ہے جس میں روپیہ رکھا تھا۔ اس میں بھی تالا پڑا تھا۔ لیکن چور نے اسے بھی آسانی سے کھول لیا۔“

ظہیر نے ایک نظر الماریوں کو دیکھا اور پھر وہ صندوق کے پاس پہنچا۔ یہ ایک پُرانی وضع کا صندوق تھا جو ڈاکٹر صاحب کے دادا نے خریدا تھا۔ اس پر سیاہ رنگ کیا ہوا تھا۔ وہ بھاری اِتنا تھا کہ دو آدمی مشکل سے اُٹھا سکیں۔ ظہیر نے آہستہ سے اُس کا ڈھکن کھولا اور اندر جھانکنے لگا۔ دو چار کاغذوں کے علاوہ صندوق میں اور کوئی چیز نہ تھی۔ اس نے کاغذوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو ان پر خُون کے دھبّے پڑے ہوئے تھے!

”یہ، یہ خُون اِن پر کیسے لگا؟“ ڈاکٹر صاحب تعجّب سے بولے۔ ”دیکھو تو بالکل تازہ ہے۔ تعجّب!“

”صرف دس گھنٹے کا باسی ہے۔“ ظہیر مُسکرا کر بولا۔ ”معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چور روپیہ نکال کر جب ڈھکن بند کرنے لگا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ کر ایک دم گر پڑا اور چور کا ہاتھ اس کے نیچے دب گیا اور یہ اُسی کے خُون کے نشان ہیں۔ یا ممکن ہے اُنگلی دب گئی ہو۔“

”اُنگلی؟“ وہ بڑبڑاتے ہوئے چھت کی طرف گھُورنے لگا جیسے کوئی بات سوچ رہا ہو اور پھر ایک یکایک کُود کر بولا۔ چلو شوکت سائیکلیں پکڑو۔ جلدی کرو۔ ڈاکٹر صاحب آپ اطمینان رکھیے۔ اب چور کہیں بچ کر نہیں جا سکتا۔ حامد خاں نے کون سا ہوٹل بتایا تھا؟“

”کشمیر ہوٹل۔ میکلوڈ روڑ۔“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اور بے وقوفوں کی طرح اس کا مُنہ تکنے لگے۔

”ٹھیک ہے۔ چلو شوکت! ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ ہمیں جلد از جلد کشمیر ہوٹل پہنچنا ہے۔“

بے تحاشہ سائیکلیں دوڑاتے وہ کشمیر ہوٹل پہنچے اور ظہیر جلدی جلری سیڑھیاں

چڑھتا ہوا مینجر کے کمرہ میں پہنچا۔ ایک مُنشی میز پر بیٹھا رجسٹر اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔

"معاف فرمایئے۔" ظہیر نے مُنشی سے کہا۔ "آپ کے ہوٹل میں کوئی صاحب حامد خاں نامی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ راولپنڈی سے آئے ہیں۔ چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔"

"راولپنڈی سے آئے ہیں چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔" مُنشی مسافروں کا رجسٹر کھول کر بولا۔ "حامد خاں نام ہوں ہوں۔ نا نا نا۔ ارے رحیم نمبر ۵ میں چائے دے کر آؤ اور نمبر ۹ سے پوچھو کھانا کس وقت کھائیں گے۔ ہاں صاحب تو کیا نام بتایا آپ نے؟"

"حامد خاں! چمڑے کے سوداگر۔" ظہیر کے دِل میں آیا کہ مُنشی کے بچّے کی گھونسہ مار کر ناک توڑ دے۔

"یہ لیجیے یہ رہے حامد خاں۔" مُنشی رجسٹر میں نام ڈھونڈ کر بولا۔ "ترسوں تشریف لائے تھا۔ کمرہ نمبر ۱۰ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ اُن سے مِلنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔۔" ظہیر آہستہ سے بولا۔ "میں کل رات بھی آیا تھا۔ مگر نوکروں نے کہا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے۔۔۔۔"

"اجی صاحب! وہ تو عجیب آدمی ہیں۔" مُنشی ناک کھجلاتے ہوئے بولا۔ "بڑی رات گئے آتے ہیں۔ کل ہی کا واقعہ ہے ہم بارہ بجے ہوٹل بند کر کے لیٹ گئے کہ قریب ڈیڑھ دو بجے کے حضرت تشریف لائے اور بے تحاشا دروازہ کھٹ کھٹانا شروع کر دیا۔ چوکیدار بھی عاجز آ چُکا ہے۔ ایسے مسافروں سے تو ہم بھر پائے۔ آج میں میجر صاحب سے کہُوں گا (آہستہ سے) آپ کے پاس کوئی بیڑی ہے؟"

"جی نہیں میں بیڑی نہیں پیتا۔" ظہیر بولا۔ "اچھّا کل رات دو بجے جب حامد صاحب واپس آئے تو خالی ہاتھ تھا یا کُچھ سامان بھی ان کے ساتھ تھا؟ ذرا غور کر کے بتائیے۔"

"صاحب! مجھے تو پتا نہیں۔ میں تو بارہ بجے سو جاتا ہوں۔" مُنشی نے جواب دیا۔ "اس کا جواب تو چھدّا چوکیدار ہی سے سکتا ہے۔ اور وہ شام کو آئے گا۔ مگر بات کیا ہے؟ آپ پولیس والوں کی طرح ایسے سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں یُونہی۔ آپ گھبرائیے نہیں۔" ظہیر نے کہا۔ "میں ان سے مِلنا چاہتا ہوں۔ کمرا نمبر ۱۰ کدھر ہے؟"

"تیسری منزل پر بائیں طرف۔ اس طرف تشریف لے جائیے۔ ارے رحیم وہ چائے پہنچا آیا؟"

مُنشی کو بڑبڑاتا چھوڑ کر دونوں کئی ایک زینے طے کر کے تیسری منزل پر پہنچے۔ چاروں طرف کمرے بنے تھے اور بیچ میں چھوٹا سا صحن تھا۔ یہ نمبر ۸، یہ ۹۔۔۔ اور۔۔۔" شوکت نمبر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور وہ نمبر ۱۰ ہے۔ آؤ۔ چُپ چاپ، آواز نہ ہو۔" ظہیر نے شوکت کا ہاتھ دبا کر کہا۔

دروازہ پر چق پڑی تھی اور جب دونوں دروازے کے قریب پہنچے تو اُنہیں کھُسر پھُسر کی آواز سُنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو آدمی بڑی آہستگی سے باتیں کر رہے ہیں۔ مگر پھر بھی کوئی لفظ ان کی سمجھ میں آجاتا تھا۔ "کیا میں نے کم محنت کی ہے؟" ایک دبی ہوئی آواز آئی۔ "دیکھو سردار خاں! تم نے ہمیشہ مجھ

سے۔۔۔۔۔" "آہستہ بول کم بخت!" دوسری آواز آئی۔ "مرتا کیوں ہے؟ لے یہ۔ دیکھ۔ اب ٹھیک! ہوں۔"

"شوکت!" ظہیر نے آہستہ سے کہا۔ "تو جا کر ہوٹل کے مینجر اور تین چار نوکروں کو بُلا لا۔ جا۔ جلدی کر۔"

شوکت دبے دبے قدم رکھتا ہوا چلا گیا تو ظہیر نے چق ہٹا کر دروازہ کھٹ کھٹایا۔ کھُسر پھُسر بند ہو گئی اور ایک گرج دار آواز آئی۔ "کون؟"

"دروازہ کھولو۔" ظہیر نے بھاری آواز میں کہا۔

"ٹھہرو!" آواز آئی۔

اس کے بعد کچھ کھٹ پٹ اور کھڑ بڑ کی آوازیں آئیں اور پھر حامد خان نے آ کر دروازہ کھولا۔ "کیا بات ہے؟ ایں! تم وہی تو نہیں جو مجھے ڈاکٹر صاحب کے گھر مِلے تھے؟"

"بالکل وہی۔" ظہیر نے کہا اور دروازے کو اتنے زور سے دھکّا دیا کہ حامد خاں

چاروں شانے چِت زمین پر گر پڑا۔ دُوسرا آدمی گھبرا کر پلٹا اور گھونسا تان کر ظہیر کی طرف بڑھا مگر ظہیر ڈپٹ کر بولا۔ ”خبردار آگے بڑھے تو گُل دان مار کر سر توڑ دوں گا۔ بھانڈا پھُوٹ چُکا ہے۔ تم دونوں ہی نے کل رات ڈاکٹر نذیر حسین کے گھر چوری کی تھی اور یہ اُن ہی کا سامان ہے جو میز پہ بکھرا پڑا ہے۔ میں کہتا ہوں چُپ چاپ کھڑے رہو۔ اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرو۔“

اچانک باہر بہت سے آدمیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد شوکت ہوٹل کے مینجر اور دو چار نوکروں کر لیے ہوئے اندر آ گیا۔ حامد خاں اور اس کے ساتھی نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی۔ مگر کُچھ پیش نہ گئی۔ سب نے مل کر دونوں بدمعاشوں کو پکڑ کر مشکیں کس لیں اور پولیس کے حوالے کر دیا۔

”ظہیر میاں!“ پولیس انسپکٹر سارا واقعہ سُن کر بولا۔ ”تم نے وہ کام کیا ہے جس کی توقّع کِسی بڑے جاسوس سے بھی نہیں ہو سکتی۔ آفرین ہے تمہاری عقل و ذہانت پر۔ یہ شخص جس کا نام تُم حامد خاں بتا رہے ہو، اصل میں اس کا نام سردار خاں ہے اور یہ پیشہ ور چور ہے۔ دو دفعہ سزا بھی پا چُکا ہے۔ اس کے چوری کرنے کے

طریقے بھی انوکھے ہیں۔ کسی شہر میں جا کر ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہے اور پھر وہاں کے بڑے بڑے آدمیوں سے میل ملاپ بڑھاتا ہے۔ آدمی چرب زبان اور شریف صُورت ہے۔ اس لیے لوگ اس کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور باتوں باتوں میں اپنے سارے بھید اُسے بتا دیتے ہیں اور یہ موقع پا کر اُنھیں لوٹ کر چلتا بنتا ہے۔ پولیس بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھی۔ مگر یہ کم بخت بہروپ ایسا بھرتا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ خیر اب تو حضرت کم از کم دس سال تک بڑے گھر کی ہوا کھائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب! آیندہ آپ احتیاط کریں اور کبھی اجنبی شخص کے ساتھ مراسم بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ بھیڑوں کی کھال میں ہزاروں بھڑیے بھی پھرتے ہیں۔"

تھانہ دار دونوں چوروں کو تھانے لے گیا تو ڈاکٹر صاحب، ظہیر اور شوکت تانگے میں بیٹھ کر گھر کی طرف چلے۔ ڈاکٹر صاحب کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ خوشی سے پھُولے نہ سماتے تھے۔

"ظہیر میرے چھوٹے بھائی!" وہ محبّت سے بولے۔ "تو نے مُجھ پر وہ احسان کیا

ہے جس کا بدلہ میں تمام عُمر نہیں اُتار سکتا۔ میری خُوشی ہے کہ تو ایک ہزار روپیہ قبول کرے۔"

"نہیں قبلہ۔ یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" ظہیر انکساری سے بولا۔ "میرا فرض ہے خلقِ خُدا کی خدمت کرنا۔"

"خیر نہیں لیتے تو نہ لو۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "یہ روپے میں غریبوں میں تقسیم کر دوں گا۔ ہاں بھئی! معاملہ کچھ پیچیدہ سا ہے۔ ذرا مُجھے بھی تو سمجھاؤ کہ تمہیں اس حامد خاں لاحول ولا قوۃ سردار خاں پر کیسے شُبہ ہوا؟"

"بات یہ ہے کہ جب تک میں نے صندوق کھول کر نہیں دیکھا تھا مجھے بھی اس پر شک نہیں ہوا تھا۔" ظہیر نے جواب دیا۔ "مگر صندوق کھولنے کے بعد کاغذوں پر مُجھے خُون کے دھبّے دکھائی دیے تو میں سمجھا ہو نہ ہو یہ کارستانی آپ کے دوست حامد خاں کی ہی ہے جس کو آپ بڑا پارسا اور نیک سمجھتے تھے۔ وہ جس وقت آپ سے ملنے آیا تھا تو اس کی انگلی پر پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ آپ نے اس کے متعلّق پُوچھا بھی تھا۔ اس کی علاوہ اس کی چال ڈھال، باتوں کے انداز اور

کپڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اگرچہ اپنے آپ کو شریف، تعلیم یافتہ اور مہذّب دکھانے کی کوشش بہت کر رہا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اُسے باتیں باتوں میں یہ بتا بیٹھے ہوں گے کہ میں اور میری بیوی ہی گھر میں رہتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ ڈاکٹر ہے۔ آمدنی اچھّی ہے۔ ضرور گھر میں سامان ہو گا۔ اس لیے اسے لوٹنا چاہیے؟"

"مگر بھئی!" اس نے میرا گھر کس طرح دیکھ لیا؟" ڈاکٹر نے تعجّب سے پُوچھا۔

ظہیر بولا۔ "بڑی آسانی سے۔ کل رات جب آپ اُسے میکلوڈ روڈ کے موڑ پر چھوڑ کر آگے بڑھے تو وہ آپ کے دِکھانے کو تھوڑی دُور چلا مگر پھر واپس آ گیا اور آپ کے پیچھے پیچھے تھوڑا فاصلہ دے کر چلنے لگا اور اس طرح آپ کا گھر دیکھ آیا۔ گھر کو اسی طرح یاد کر کے وہ اپنے سلاتھی کو بُلا لایا اور پھر دونوں گھر میں گھُس گئے۔"

"کس طرح؟ دروازہ تو اندر سے بند تھا۔" ڈاکٹر صاحب نے اعتراض کیا۔

"جی دروازہ تو بند تھا مگر اوپر چڑھنے کے لیے پرنالہ ضرور لگا ہوا ہے۔ اسی پرنالہ

کے راستے دونوں چھت پر پہنچے اور پھر نیچے اُتر آئے۔ آگے کیا ہوا؟ یہ آپ کو معلوم ہی ہے۔"

حسبِ معمول دُوسرے دِن اس واقعہ کو بھی اخباروں نے خوب بڑھا چڑھا کر شائع کیا اور ظہیر کی دل کھول کر تعریفیں کیں۔

فونٹین پن کی کرامت

ڈاک گاڑی کراچی کے اسٹیشن پر جا کر ٹھہری تو ظہیر نے اطمینان کی سانس لی اور بیگ ہاتھ میں لے بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا پلیٹ فارم پر آگیا۔

آج کل لوگوں کا ریل گاڑیوں میں سفر کرنا مُصیبت سے کم نہیں۔ پہلے تو جگہ ہی مُشکل سے ملتی ہے اور اگر کوئی خوش نصیب مُسافروں کے دھکّے کھاتا، جھڑکیاں سہتا بیٹھ بھی جائے تو اندر جو اُس کی دُرگت بنتی ہے اُسے دیکھ کر تو وہ کان کو ہاتھ لگاتا ہے کہ اب کبھی ریل میں سوار نہ ہوں گا۔

لاہور سے کراچی تک ظہیر کو بڑے تلخ تجربے ہوئے۔ اگرچہ اس کے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تھا مگر انٹر کلاس میں بھی مشکل سے جگہ ملی۔ لاہور سے کراچی تک کا سفر اس نے بیگ پر بیٹھ کر طے کیا اور اب جو وہ پلیٹ فارم پر اُترا تو اس کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ نیند نہ ہونے کی وجہ سے طبیعت بوجھل تھی اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

کراچی میں اس کے خالو زبیر احمد قریشی مجسٹریٹ تھے۔ بہت دِنوں سے ظہیر کو بُلا رہے تھے مگر فرصت نہ مِلنے کی وجہ سے وہ ٹالتا رہا۔ اب بھی اس کی طبیعت تو نہ چاہتی تھی مگر مُصیبت یہ تھی کہ خالہ زاد بھائی کی شادی تھی اور مجسٹریٹ صاحب نے اُس کے والد کو لکھا تھا کہ اگر شادی میں بھی تم نہ آئے تو میں سمجھوں گا کہ تم ہم سے میل ملاپ لکھنا نہیں چاہتے۔ پھر میں بھی عُمر بھر تمہارے گھر نہ آؤں گا۔ مجسٹریٹ صاحب کے اس خط کو دیکھ کر کپتان صاحب بھی مجبور ہو گئے۔ خود تو نہ جا سکے البتّہ ظہیر کو زبردستی بھیج دیا۔ عُمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کراچی آیا تھا۔ اسٹیشن کے در و دیوار سے اجنبیت کی بُو آ رہی تھی اور ماحول عجیب و غریب سا معلُوم ہو رہا تھا۔ ہاتھ میں بیگ تھامے، آنکھیں ملتا، لڑکھراتی چال سے وہ پھاٹک کی طرف بڑھا کہ کوئی شخص پیچھے سے آکر ایک دم اُسے لِپٹ گیا۔

"ارے ظہیر! آخر تم آ ہی گئے۔" اس کی خالہ کا منجھلا لڑکا جمیل اُسے بھینچ کر بولا۔ خوشی کے مارے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ہاں بھئی۔ اب تو آ ہی گیا۔" ظہیر نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "اگر تم کہو تو، واپس

چلا جاؤں؟"

"واہ! یہ کیسی باتیں کرتے ہو۔" جمیل مُنہ بنا کر بولا۔ "میں تمہیں ہی تو لینے آیا ہوں۔ چلو باہر موٹر کھڑی ہے۔" گیٹ کیپر کو ٹکٹ دے کر وہ باہر نِکل آئے اور جب موٹر میں بیٹھ گئے تو جمیل ظہیر کو شوخ نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "کیوں دوست! سُنا ہے کہ آپ جاسوسی فرماتے ہیں۔ آپ کی شہرت تو کراچی تک پھیلی ہوئی ہے۔"

ظہیر اپنی تعریف سُن کر مسکرانے لگا اور موٹر چل دی۔

دس منٹ میں وہ ایک عالی شان کوٹھی میں جا پہنچے۔ اندر بہت سے مہمان جمع تھے۔ بچّے، عورتیں، مرد، جوان، بوڑھے، غرضیکہ کوٹھی پر ایک چھوٹے سے قصبے کا گمان ہوتا تھا۔ پلھوںٹے بیٹے کی شادی تھی۔ اس لیے مجسٹریٹ صاحب بڑی دھوم دھام سے رچا رہے تھے۔ قریب قریب کے رشتہ داروں کے علاوہ دُور دُور سے عزیز و اقربا، دوست احباب اور مِلنے جُلنے والے بھی بُلائے گئے تھے اور کوٹھی میں اچھّا خاصا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب مہمانوں کی خاطر مدارات میں

اتنے مشغول تھے کہ انہیں اپنے آپ تک کا ہوش نہ تھا اور جب تک ظہیر اُن نے بالکل سامنے جا کر نہ کھڑا ہو گیا اور سلام نہ کر لیا، اُنھوں نے اُسے پہچانا تک نہیں۔

"سلامُ علیکُم قبلہ!" اُس نے ادب سے اُنہیں سلام کیا۔

مجسٹریٹ صاحب نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اُسے سینے سے لگا لیا اور زور سے بھینچ کر بولے "جیتے رہو بیٹا! خُدا عُمر دراز کرے۔ تمھیں دیکھ کر میری خوشی دوچند ہو گئی ہے۔ لیکن تمھارے ابّا، امّی اور بھائی بہن کہاں ہیں؟ وُہ نہیں آئے۔"

"جی ابّا جان تو آج کل بے حد مصروف ہیں۔ امّی کی طبیعت ناساز ہے اور اسلم و ناہید کے امتحان ہیں۔ رہ گیا میں تو مُجھے ہی کراچی آنا پڑا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ تم آ گئے یہی غنیمت ہے۔" مجسٹریٹ صاحب نے کہا۔ "لمبا سفر کرنے سے تھک گئے ہو گے۔ جاؤ جا کر آرام کر لو۔ جمیل ظہیر کو کسی خالی کمرے میں لے جاؤ۔"

چارپائی پر لیٹتے ہی ظہیر کو نیند آ گئی اور وہ ۴، ۳ گھنٹہ خُوب گہری نیند سویا۔ سہ پہر

کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو طبیعت ترو تازہ تھی اور تکان بھی دور ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے اُٹھ کر غسل کیا اور کپڑے پہن کر باہر نِکل آیا۔

مہمان چائے پی رہے تھے۔ مجسٹریٹ صاحب نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا اور مہمانوں سے بولے۔ "یہ میرا بھانجا ظہیر ہے۔ ماشاء اللہ بڑا عقل مند اور ذہین ہے۔ سُراغ رسانی میں تو بڑے بڑے جاسوسوں کے کان کاٹتا ہے۔ آپ نے اس کے کارنامے اخباروں میں پڑھے ہی ہو گے۔" "شہرت تو ہم نے بہت سُنی تھی۔ آج آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔" ایک داڑھی والا شخص جو خوب رئیسانہ کپڑے پہنے تھا۔ مُسکرا کر بولا۔ "میرے خیال میں پاکستان کا کوئی ہی باشندہ ایسا ہو گا جو ظہیر جاسوس کو نہ جانتا ہو۔"

"جی ہاں۔ اور اگر اس محفل میں کوئی چور صاحب تشریف رکھتے ہوں تو وہ خبر دار ہو جائیں۔" مجسٹریٹ صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔ اس پر دوسرے بھی ہنسنے لگے اور ڈاڑھی والا شخص آنکھیں مٹکا کر بولا۔ "میں نے تو جب سے ان کی صورت دیکھی ہے میری تو رُوح فنا ہو جا رہی ہے۔"

"مُعاف فرمائیے۔ میں چوروں اور اُچکّوں کو ہی پکڑتا ہوں۔ شریف آدمیوں کو نہیں۔" ظہیر نے مُسکرا کر جواب دیا۔

بہت دیر تک باتیں ہوتی ہیں اور ظہیر حاضرین کو اپنے کارنامے مزے لے لے کر سُناتا رہا۔ کُچھ دیر بعد چائے ختم ہو گئی اور مہمان اُٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ظہیر مجسٹریٹ صاحب کو الگ لے گیا اور آہستہ سے بولا۔ "یہ ڈاڑھی والا شخص کون ہے؟"

مجسٹر صاحب نے اُسے چونک کر دیکھا اور حیرت سے پُوچھا۔ "کون؟ پروفیسر باقر؟ اماں یہ میرے ایک دوست کے دوست ہیں۔ اُسے چونکہ چھُٹّی نہیں ملی، اس لیے اُس نے انہیں بھیج دیا ہے بس اس سے زیادہ میں ان کے بارے میں اور کُچھ نہیں جانتا۔ مگر کیا بات ہے؟ کیا انہوں نے تم سے کُچھ کہا؟"

"نہیں تو۔ مُجھے تو کُچھ نہیں کہا۔" ظہیر ٹال کر بولا۔ "جانے دیجیے۔ دیکھیے آپ کو کوئی بُلا رہا ہے۔"

رات بھر گانا بجانا رہا اور ہڑبونگ مچی رہی۔ دو تین بجے کے قریب ظہیر کو نیند آئی

اور وہ ایسے گھوڑے بیچ کر سویا کہ صُبح کو نو بجے کے قریب مجسٹریٹ صاحب نے آ کر اُسے جگایا۔

"ارے میاں! کب تک پڑے سوتے رہو گے۔" وُہ اُسے جھنجھوڑ کر بولے۔ "اُٹھو ایک عجیب واقعہ ہو گیا ہے۔"

ظہیر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا۔ "کیسا واقعہ، فرمایئے۔"

"ہاتھ مُنہ دھو کر باہر آؤ تو تمہیں بتاؤں۔" مجسٹریٹ صاحب بولے۔ "جلدی سے آجاؤ۔ میں دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوں۔"

ظہیر جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہُوا اور نہا کر مجسٹریٹ صاحب کے پاس پہنچا۔ وُہ اُسے اشارے سے ایک کونے میں لے گئے اور چُپکے سے بولے۔ "رات کسی نے لیاقت علی کی جیب کا صفایا کر دیا۔ وہ کہتے ہیں بٹوے میں پانچ سو روپے تھے۔ بیچارے بڑے شریف آدمی ہیں۔ مجھے تنہائی میں لے جا کر بتایا۔"

"یہ تو بڑی افسوس ناک خبر سُنائی آپ نے۔" ظہیر بولا۔ "خیر میں تفتیش کروں

گا۔ آپ بھی اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کریں۔"

بات اس کے مُنہ میں تھی کہ کمرے میں ایک صاحب داخل ہوئے اور قریشی صاحب کے پاس آکر بولے۔ "قریشی صاحب! مُعاف فرمایئے۔ ابھی ابھی مجھے ایک نہایت ہی انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔"

"کہیے کہیے مرزا صاحب! کیا واقعہ پیش آیا؟" مجسٹریٹ صاحب نے جلدی سے پُوچھا۔

"اجی حضرت! بڑی حیرانی کی بات ہے۔" مرزا صاحب سر کھُجلاتے ہوئے بولے۔ "ابھی ابھی میں نہا کر واپس آیا اور شیروانی دیکھی تو گھڑی غائب تھی۔ اِدھر اُدھر تلاش کی۔ مگر کہیں بھی نہیں ملی۔ حیران ہوں کہ۔۔۔"

"لو یہ ایک اور ہوئی۔" مجسٹریٹ صاحب نے کہا۔ "اب کہو میاں ظہیر صاحب! کیا کہتے ہو؟"

"گھبرایئے نہیں! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ظہیر نے جواب دیا۔ "مہربانی کر کے

کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔“

”بہت اچھّا۔“ مرزا صاحب سر ہلا کر بولے اور سر کھجلاتے ہوتے چلے گئے۔

”سمجھ میں نہیں آتا یہ کس نامعقول کی حرکت ہے۔“ مجسٹریٹ صاحب بولے۔ ”اگر دُوسرے مہمانوں تک اُڑتے اُڑتے یہ خبریں پہنچ گئیں تو سب لوگ پریشان ہو جائیں گے اور میری سخت بدنامی ہو گی۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے تو پروفیسر باقر مِل گئے۔ کُچھ پریشان سے معلوم ہوتے تھے۔ مجسٹریٹ صاحب کو دیکھ کر دوڑتے ہوئے پاس آئے اور بولے۔ ”اجی حضرت! آپ یہاں ہیں میں آپ کو آدھ گھنٹے سے تلاش کرتا پھر رہاہوں۔“

”کیوں خیر تو ہے؟“ مجسٹریٹ نے دھڑکتے ہوئے دِل سے پُوچھا۔

پروفیسر صاحب نے دائیں بائیں نظر ڈالی اور اتنی آہستہ سے کہ ظہیر مُشکل سے سُن سکا۔ بولے۔ ”خدا معلوم کس کی کارستانی ہے۔ بہ ظاہر تو کسی پر شبہ نہیں کیا جا

سکتا۔ مُجھے آپ سے کہتے ہوئے سخت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔ مگر بغیر کہے بھی چارہ نہیں۔ دراصل دیکھیے نا معاملہ ہی کُچھ ایسا ہے۔ سوچتا ہوں کہوں یا نہ کہوں؟"

"اب کہہ بھی ڈالیے حضرت!" مجسٹریٹ صاحب بے تابی سے بولے۔

پروفیسر صاحب نے ایک دفعہ پھر چاروں طرف نظریں گھُما کر دیکھا اور بولے۔ "اجی حضرت رات کسی ستم ظریف نے میری جیب کا صفایا کر دیا۔ تین سو روپے۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ خیر جانے دیجیے؟"

"تیسری ہے۔" مجسٹریڑ صاحب سٹپٹا کر بولے۔

"تیسری کیسی؟" پروفیسر صاحب نے حیرت سے پُوچھا۔ "کیا اور کسی کی بھی چوری ہو چُکی ہے؟"

"جی ہاں! مرزا صاحب اور لیاقت صاحب کا سر بھی کسی نے مونڈ لیا ہے۔" مجسٹریٹ صاحب نے جواب دیا۔

”تو یوں کہیے چور نے سارے گھر کو لوٹنے کی ٹھان لی ہے۔“ پروفیسر صاحب بولے۔

”خیر میں نے اوروں سے بھی کہہ دیا ہے اور آپ سے بھی کہتا ہوں کہ اس کے متعلّق کسی سے ذکر نہ کیجیے۔“ ظہیر بولا۔ ”اگر چور کو پتہ چل گیا کہ کوئی اُسے تلاش کر رہا ہے تو وہ چوکنّا ہو جائے گا۔“

”بہُت اچھّا جیسی آپ کی خُوشی۔ میری طرف سے بالکل اطمینان رکھیے۔“ پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔

پروفیسر صاحب چلے گئے تو مجسٹریٹ صاحب بولے۔ ”ظہیر بیٹا! میری عزّت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر چور کا پتا نہ چلا تو میں مُنہ دِکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔“

”میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑوں گا۔“ ظہیر نے اُنہیں اِطمینان دِلایا۔ ”ویسے کامیابی اور ناکامی تو خُدا کے ہاتھ میں ہے۔ آپ جایئے اور سارا مُعاملہ مُجھ پر چھوڑ دیجیے۔“

"اچھا میں جاتا ہوں۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔" مجسٹریٹ صاحب بولے۔
"مگر بیٹا! فونٹین پن جیب کے اندر کرلو۔ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں
گر پڑے اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔"

ظہیر نے فونٹین پن نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

دن یونہی ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ سہ پہر تک اور بہُت سے مہمان آگئے اور کوٹھی میں
تِل دھرنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ چوری کے متعلّق نہ تو مجسٹریٹ صاحب نے ہی
کسی سے کُچھ کہا اور نہ ظہیر نے۔ البتّہ کبھی کبھی مجسٹریٹ صاحب آنکھوں ہی
آنکھوں میں پُوچھ لیتے تھے کہ کہو کُچھ سُراغ ملا اور ظہیر انہیں ویسے ہی جواب
دے دیتا کہ مطمئن رہو۔ میں غافل نہیں ہوں!

سہ پہر کو چائے سے پہلے ظہیر نے اپنا کوٹ دروازے کے پاس ٹانگ کر باہر چلا
گیا۔ واپس آکر کوٹ پہنا اور جیب دیکھی تو بٹوہ اور فاؤنٹین پن غایب تھے۔

"چلو یہ اچھا ہوا۔" وہ مُسکرا کر بولا۔ "اور اب میاں چور! میں دیکھتا ہوں کہ تم
میرے ہاتھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔"

باغیچہ میں اُس کی پروفیسر صاحب سے مُڈ بھیڑ ہو گئی۔ دیکھتے ہی بولے۔ ”کہیے ظہیر صاحب! کیا خبر ہے؟ چور نے آپ کا صفایا تو نہیں کیا؟ بھئی میں تو بڑا گھبرا رہا ہوں۔“

”جی نہیں! شکر ہے کہ میری جیب محفوظ ہے۔“ ظہیر مسکرا کر بولا اور پروفیسر صاحب کی جیب کے نیچے سیاہی کا بڑا سا دھبّہ دیکھ کر اُچھل پڑا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ پروفیسر صاحب اجنبھے سے بولے

”جی کچھ نہیں۔ پیر میں کیل چُبھ گئی تھی۔“ اس نے بہانہ کیا۔ ”یہ کم بخت جوتا بہُت تنگ کرتا ہے۔“

”اچھّا۔“ پروفیسر صاحب بولے۔ ”یہ تو فرمایئے چور کا بھی کوئی پتا چلا ہو ہم یونہی۔۔۔۔“

”آہستہ بولیے۔“ ظہیر نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر کہا۔ ”میں برابر کھوج لگا رہا ہوں۔ خُدا نے چاہا تو آج رات تک ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔“

"آمین۔" پروفیسر صاحب بولے۔ "اگر میرے روپے واپس مِل گئے تو اُن میں سے پچاس روپے آپ کی نذر کر دوں گا۔"

"شکریہ! اس کی ضرورت نہیں۔" ظہیر نے جواب دیا اور باغیچہ پار کر کے برآمدے میں گھُس گیا۔

رات کو کھانے پر کوئی بیس تیس مہمان جمع تھے۔ کھانا شروع ہوا تو ظہیر پیٹ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے سخت تکلیف میں مُبتلا ہے۔

"خیر تو ہے۔ میاں ظہیر! کیا بات ہے؟" مجسٹریٹ نے گھبرا کر پُوچھا۔

"اُف! پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔ آپ کھائیے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے ساتھ شریک نہ ہو سکوں گا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب مہمان کھانا کھا چُکے تو وہ مُسکراتا ہُوا آیا اور ہاتھ اُٹھا کر بولا۔

"صاحبان! اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیے۔ میں آپ کو ایک بڑا دلچسپ قصّہ سُناؤں گا جسے سُن کر آپ الف لیلہ کی کہانیوں کو بھی بھُول جائیں گے۔"

مہمان خاموشی سے بیٹھ گئے اور حیرت سے ظہیر کی طرف دیکھنے لگے۔

"حضرات!" ظہیر نے تقریر شروع کی۔ آج صُبح اس مکان میں بڑے عجیب واقعات رونما ہوئے۔ رات کسی نے لیاقت علی صاحب کی جیب سے پانچ سو روپے نکال لیے اور اس کے بعد مرزا صاحب کے ساتھ یہی واقعہ ہوا۔ اُن کی بھی کسی نے گھڑی اُڑالی۔ ان کے بعد بے چارے پروفیسر صاحب کی شامت آئی اور اُن کے تین سو روپے غائب ہو گئے۔ اور تو اور ظالم نے مُجھے بھی نہیں چھوڑا اور دن دہاڑے میری کوٹ کی جیب سے بٹوا اور فونٹین پن نکال لیا۔" اِتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ مہمان آپس میں کاناپھُوسی کرنے لگے اور تھوڑی دیر کے لیے مجلس میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔

"صاحبان!" ظہیر کی آواز گونجی۔ "میں نے جان بُوجھ کر کوٹ ایسی جگہ لٹکا دیا تھا کہ چور کو جیب کا صفایا کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ میں تو خُدا سے چاہتا تھا کہ چور میرا فونٹین پن اُڑائے۔ خُدا کا شکر ہے کہ مُجھے اس میں کامیابی ہوئی اور آپ کو یہ سُن کر خُوشی ہو گئی کہ چور کا پتہ چل گیا ہے۔"

اس پر محفل میں حیرت کی آوازیں بُلند ہوئیں۔ مجسٹریٹ صاحب جوش کے مارے اُٹھ بیٹھے تھے۔ ظہیر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرایا اور مُسکرا کر بولا۔ ”فونٹین پن جس کا میں بھی ذکر کر رہا تھا، اُس کی ربڑ میں سوراخ تھا۔ میں نے اُس میں روشنائی بھر کر کوٹ کی جیب میں رکھ دیا اور باہر چلا گیا۔ چور صاحب آئے اور نہایت اِطمینان سے اُسے نکال کر لے گئے۔ چونکہ فونٹین پن میں سے روشنائی ٹپکتی تھی، اس لیے چور کے کوٹ پر دھبّے پڑ گئے اور میں نے اُسے پکڑ لیا۔ گھبرایئے نہیں۔ ابھی ابھی میں ان حضرت کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔“

”یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور مہمانوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا پروفیسر باقر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مہمان بُت بنے ہوئے اُسے دیکھ رہے تھے۔

”تو حضرات! یہ ہیں وہ چور صاحب جنہیں آپ پروفیسر باقر کہتے ہیں۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔

پروفیسر صاحب ایک دم کھڑے ہو گئے اور غصّے میں بھر کر بولے۔ ”شرم کرو۔

کسی شریف آدمی پر جھوٹا الزام لگانے کا نتیجہ معلوم ہے کیا ہوتا ہے؟ میں تم پر ہتک کا دعویٰ کر دوں گا۔" "ذرا ٹھہریے! ذرا ٹھہریے!" ظہیر نے کہا۔ "اِتنے گرم نہ ہو جایئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ آپ چور ہیں یا شاید؟ صاحبان! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ چور پر روشنائی کا دھبّہ پڑا ہوا ہے۔ سو دیکھیے دھبّہ یہ موجود ہے۔" اُس نے پروفیسر کی جیب اُٹھا کر سب کو دِکھائی۔ "اور لیجیے میرا فونٹین پن بھی اس میں پڑا ہوا ہے۔ یہ دیکھیے یہ رہا۔" اس نے بڑی پھُرتی سے پروفیسر کی جیب سے فونٹین پن نکال لیا اور مجسٹریٹ صاحب سے بولا۔ "خالو جان! یہ میرا ہی قلم ہے نا؟"

"ہاں ہاں تمہارا ہی ہے۔" مجسٹریٹ صاحب بولے۔ "میں نے دوپہر ہی تو تمہاری جیب میں دیکھا تھا۔"

"بالکل ٹھیک! شکریہ!" ظہیر بولا۔ "اب تو آپ صاحبان کو یقین ہو گیا ہے کہ پروفیسر صاحب چور ہیں اور میں نے ان پر جو الزام لگایا تھا، وہ غلط نہیں۔ سہ پہر کو میں نے اُن کے کوٹ پر روشنائی کا دھبّہ دیکھا تو ساری حقیقت واضح ہو گئی۔

چنانچہ میں اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ کسی صورت سے پروفیسر صاحب کے سامان کی تلاشی لُوں۔ خوش قسمتی سے یہ موقع جلد ہی مل گیا۔ کھانے کے وقت میں پیٹ درد کا بہانہ کر کے اُٹھ گیا حالانکہ میرے پیٹ میں درد نہ تھا۔ میں پروفیسر صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ بکسوں کے تالے توڑ کر سامان کی چھان بین کی تو تمام گُم شدہ چیزیں مل گئیں۔ یہ چیزیں یعنی روپیہ کے بٹوے اور گھڑی ان کے بکس میں موجود ہیں۔ خالو جان! آپ بکس اُٹھالائیے تاکہ سب صاحبان اُسے دیکھ لیں۔"

مجسٹریٹ صاحب دوڑے دوڑے باہر گئے اور پروفیسر صاحب کا بکس اُٹھا لائے۔ اُسے کھول کر دیکھا تو واقعی اس میں وہ چیزیں موجود تھیں جو چوری ہو گئی تھیں۔

پروفیسر صاحب کی اسی وقت یہ حالت تھی کہ ؏

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ مجسٹریٹ صاحب آگے بڑھے اور گرج کر بولے۔ "پروفیسر باقر! اگرچہ آپ اس لائق ہیں کہ آپ کو فوراً پولیس کے حوالے کر دیا

جائے۔ مگر صرف اپنے دوست کی خاطر جس نے آپ کو یہاں بھیجا ہے، میں آپ
کو مُعاف کرتا ہوں۔ مگر مہربانی فرما کر اسی وقت یہاں سے دفع ہو جائیے۔
جائیے۔"

جمیل موٹر میں بٹھا کر پروفیسر صاحب کو اسٹیشن چھوڑ آیا۔ لیاقت علی صاحب اور
مرزا صاحب کو اُن کے روپے اور گھڑی واپس دے دیئے گئے اور سب لوگ
اِطمینان سے سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

دھمکی

ٹرن ٹرن۔ ٹرن ٹرن۔ ٹرین ٹرن۔ ٹرن ٹرن۔ ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی۔ ظہیر شام کا کھانا کھا کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ امّی جان بولیں۔ "ظہیر بیٹا! دیکھو تو ٹیلی فون پر کون ہے؟"

"ابّا جان کہاں ہیں؟" ظہیر ٹیلی فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"وہ تو شیروانی پہن کر باہر چلے گئے۔ کہہ گئے ہیں کہ ذرا دیر سے آؤں گا۔" امّی جان نے جواب دیا۔

ظہیر نے ٹیلی فون کا چونگا کان سے لگایا اور بولا۔ "جی فرمایئے! جی ہاں! یہ کپتان رشید صاحب ہی کا مکان ہے۔ جی؟ جی میں ظہیر بول رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ میں ہی ظہیر ہوں۔ فرمایئے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی اور پھر آواز آئی۔ "مُعاف فرمایئے۔ میرے اس وقت

حواس بجا نہیں۔ میں ماڈل ٹاؤن سے بول رہا ہوں۔ میرا نام غیّاث الدّین ہے۔ غیاث الدّین وکیل۔ ابھی ابھی مُجھے ایک گُمنام چِٹھّی موصول ہوئی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ آج رات کو تمہارے گھر میں نقب لگائی جائے گی۔"

"نقب لگائی جائے گی۔" ظہیر نے اچنبھے سے پُوچھا۔ "یہ چِٹھّی ڈاک سے آئی ہے یا کوئی دستی دے گیا ہے؟"

"دستی آئی ہے۔ ابھی ابھی ایک لڑکا دے گیا ہے۔" وکیل صاحب نے جواب دیا۔ "جب سے میں نے وُہ چِٹھّی پڑھی ہے، نہ بیٹھے چین ہے نہ اُٹھے۔ کلیجہ مُنہ کو آرہا ہے۔ تھانے میں اس لیے رپورٹ نہیں کی کہ کہیں پولیس والے میرا مذاق نہ اُڑائیں۔ مُمکن ہے آپ بتا سکیں کہ آیا کسی نے یُونہی مُجھے ڈرانے کے لیے یہ چِٹھّی بھیج دی ہے۔ مگر میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی مُصیبت آنے والی ہے۔ مُصیبت یہ ہے کہ اس وقت گھر میں بالکل اکیلا ہوں۔ اس لیے آپ جلد تشریف لے آیئے اور خود آکر چِٹھّی دیکھ لیجیے۔"

"ماڈل ٹاؤن میں کِس جگہ آپ کا مکان ہے؟" ظہیر نے سوال کیا۔

"۴ ماڈل ٹاؤن۔ مکان نمبر ۵۵۔" جواب ملا۔ "دروازے پر میرے نام کا بورڈ لگا ہے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس آڑے وقت میں آپ ضرور میری مدد فرمائیں گے۔"

"بہت اچھّا! میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" ظہیر نے کہا اور چونگا رکھ دیا۔

کُچھ عجیب سا مُعاملہ تھا۔ گمنام چٹھّی۔ گھر میں نقب لگانے کی دھمکی۔ اُس نے سوچا۔ اِن باتوں کا مُجھ سے کیا تعلُق؟ چوری کا سُراغ تو میں لگا سکتا ہوں مگر کسی کو چوری کرنے سے کیسے روک سکتا ہوں؟ یہ کام تو پولیس کا ہے یا پھر گھر والوں کا۔ میں کوئی خُدائی فوجدار تو ہوں نہیں کہ لوگوں کے مکانوں کی حفاظت کرتا پھروں لیکن پھر خیال آیا بے چارے وکیل نے مُصیبت کے وقت مُجھ سے مدد مانگی ہے اور میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ وعدے سے پھر جانا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ جیسا کُچھ بھی ہو چلنا چاہیے۔

اُس نے کمرے سے ٹارچ لی اور امّی جان سے بولا۔ "ابھی ابھی فون پر ایک صاحب نے مُجھے بُلایا ہے۔ ضروری کام ہے۔ دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا۔ جلد سے

جلد آنے کی کوشش کروں گا۔“

جنوری کا مہینہ تھا اور شام کے ۸ بج چُکے تھے۔ بارش ہونے کی وجہ سے سڑک پر آمد و رفت بُہت کم تھی۔ اِکّادُکّا راہگیر نظر پڑ جاتا تھا یا پھر کوئی موٹر چھینٹیں اُڑاتی غن سے نکل جاتی۔ ظہیر اوور کوٹ میں مُنہ چھپائے سُکڑتا سُکڑاتا بسوں کے اڈّے پر پہنچا۔ اِتّفاق سے ماڈل ٹاؤن جانے والی ایک بس بالکل تیّار کھڑی تھی۔ وہ لپک کر چڑھ گیا اور بس چل دی۔

پاؤ گھنٹے بعد ماڈل ٹاؤن جا کر اُترا تو چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے وہ دو ایک دفعہ ہی ماڈل ٹاؤن آیا تھا اور وہ بھی دن میں۔ آسمان پر بادل جھُوم رہے تھے اور بادل بڑے زور سے گرج رہا تھا۔ اُس نے جیب سے ٹارچ نکال لی اور آگے بڑھا چاہتا ہی تھا کہ سامنے ایک راہ گیر جاتا دکھائی دیا۔ اس نے زور سے آواز دی ”بھائی جان! ذرا بات سُننا۔“

راہ گیر ٹھہر گیا اور کمبل میں سے مُنہ نکال کر بولا۔ ”کہیے کیا بات ہے؟“

”یہ ماڈل ٹاؤن یہی ہے؟“ ظہیر نے پوچھا۔ ”میں غیاّث الدّین صاحب وکیل

کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔"

"غیّاث الدّین وکیل؟" راہ گیر سوچتے ہوئے بولا۔ "ارے ہاں! وہ جو بجلی کا کھمبا نظر آ رہا ہے نا، بس اس سے بیس قدم اُدھر اُس طرف وکیل صاحب کا مکان ہے۔ اور فرمایئے کوئی اور خدمت!"

"شکریہ۔ مہربانی!" ظہیر نے کہا اور اس بتائی ہوئی سمت کو چل پڑا۔

دو چار مکان چھوڑ کر اُس نے پانچویں مکان پر نظر ڈالی تو ایک چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا دکھائی دیا۔ "غیاث الدّین بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل۔" اُس نے ٹارچ بُجھا کر جیب میں رکھ لی اور دروازے پر آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ایک منٹ ٹھہر کر پھر آواز دی۔ اب کے بھی کسی نے جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر زور سے پُکارا۔ "جناب وکیل صاحب۔" پھر بھی کوئی نہیں بولا۔ مکان میں بالکل سنّاٹا تھا۔ "کیا وکیل صاحب کہیں چلے گئے؟" اس نے دِل ہی دِل میں کہا۔ "کسی نے مذاق تو نہیں کیا؟ لیکن نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ میں تمہارا اِنتظار کر رہا ہوں۔ پھر بولتے کیوں نہیں؟ کہیں چوروں نے وکیل

صاحب کو مار تو نہیں ڈالا؟ اندر جا کر دیکھنا چاہیے۔"

اس نے کواڑوں کو دھکّا دیا۔ وہ کھُلے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں چلتا ہوا وہ صحن میں پہنچا۔ مکان میں گھُپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ اُس نے ٹارچ روشن کی اور صحن سے گُزر کر برآمدے میں پہنچا۔ تمام کے کمرے بند پڑے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت دنوں سے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ وُہ چُپ چاپ سانس روکے اِدھر اُدھر دیکھتا بھالتا ایک کمرے کے پاس پہنچا تو اُسے اندر سے کُچھ کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ رُک کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر سُننے لگا۔ کُچھ وقفے کے بعد پھر وہی آواز آئی۔ اس نے ٹارچ سے دروازے کو دیکھا۔ کُنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ آہستہ سے کُنڈی کھولی اور دروازہ کھول کر اندر گھُس گیا۔ ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک اُس کا ہاتھ بجلی کے سوئچ سے ٹکرا گیا اور کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھا۔

بیچ کمرے کے ایک ادھیڑ عُمر کا آدمی کُرسی پر بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ کُرسی کے پیچھے رسّی سے بندھے تھے اور مُنہ میں رومال ٹھنسا ہوا تھا۔ ظہیر بھاگتا ہوا اُس کے پاس

پہنچا اور مُنہ میں سے رومال نِکال دیا۔

''تمہارا نام ظہیر ہے، ظہیر؟'' اجنبی ایک لمبی سی سانس لے کر مری ہوئی آواز میں بولا۔ ''افسوس تم بہت دیر سے پہنچے۔ سارا کھیل ختم ہو گیا۔''

''آپ کون ہیں اور کس نے آپ کی یہ حالت کی؟'' ظہیر نے اُس کے ہاتھ کھولتے ہوئے پُوچھا۔

''میں ہی وہ غیاث الدّین وکیل ہوں۔ جس نے تمہیں فون کیا تھا۔'' وکیل صاحب کراہتے ہوئے بولے۔ ''بدمعاشوں نے میرے پیر بھی باندھ دیے ہیں۔

بیٹا! انہیں کھول دو۔"

ظہیر نے پیر بھی کھول دیے تو وکیل صاحب کھڑے ہو گئے اور ہاتھوں کو دبا کر بولے۔ "شکریہ میاں صاحب زادے۔"

"اب آپ مہربانی فرما کر مُجھے سارا واقعہ سُنایئے۔" ظہیر نے بے تابی سے کہا۔

"آدھ گھنٹا پہلے میں تم سے ٹیلی فون پر گفتگو کر رہا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔ "ٹیلی فون رکھ کر میں کُرسی پر بیٹھنا چاہتا تھا کہ اس کمرے میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی شیشہ توڑ تا ہے۔ دوڑ تا ہوا کمرے میں گیا اور اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو آدمی الماریوں اور بکسوں کی چیزیں اُلٹ پلٹ کر رہے ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے اور میں نے مدد کے لیے چیخیں ماریں۔ چیخوں کی آواز سُن کر وہ میرے اُوپر ٹوٹ پڑے اور مُنہ میں رومال ٹھونس کر کُرسی سے جکڑ دیا۔ جب سے اب تک میں برابر کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ہاتھ پیر کھُل جائیں۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ خُدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے اور۔۔۔"

"آپ نے بد معاشوں کی صُورت تو دیکھی ہو گی؟" ظہیر نے پُوچھا۔

"افسوس ہے کہ اس کے متعلّق میں تمہیں کُچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ ایک تو خوف کے مارے میری آنکھیں بند تھیں اور دوسرے وہ سیاہ نقاب پہنے ہوئے تھے۔"

"سیاہ نقاب؟" ظہیر نے کہا۔ "تو گویا وہ پیشہ ور ڈاکو ہیں۔ آپ نے غلطی کی کہ پولیس کو چِٹھّی نہیں دکھائی۔"

"خیر اب تو جو کچھ ہُوا ہو گیا۔" وکیل صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ "پچھلی حماقتوں کو یاد کر کے آنسو بہانے سے کیا فائدہ؟"

"یہ۔۔۔ یہ کھڑکی کا شیشہ کیسے ٹوٹا؟" ظہیر نے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اسی کو توڑ کر تو بدمعاش اندر گھُسے تھے۔" وکیل صاحب نے جواب دیا۔ "میں نے ڈر کے مارے شام ہی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ مگر وہ کھڑکی توڑ کر اندر گھس آئے۔ یہ کھڑکی باہر کی جانب ہے اور زمین سے صرف ۴ یا ۵ فٹ اُونچی ہے۔ اس لیے انہیں اُوپر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔" ظہیر فرش کو دیکھتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا اور ٹارچ جلا کر باہر کی طرف جھانکا۔ سڑک پر ٹوٹے ہوئے

شیشے کے ٹکڑے پڑے چمک رہے تھے۔ تھوڑی دیر وہ باہر دیکھتا رہا اور پھر اس طرح سر ہلایا جیسے معاملہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور وہ اس کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے۔

"ڈاکو کھڑکی توڑ کر کمرے میں داخل ہوئے تھے اور شیشے باہر پڑے ہیں۔ خُدایا! یہ کیا اسرار ہے۔" ظہیر کے مُنہ ہی مُنہ میں بُڑبڑایا کر بولا۔

وکیل صاحب کھڑے اس کا مُنہ تک رہے تھے۔ بولے۔ "ہاں! میں نے ابھی تک یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ بدمعاشوں نے کیا کیا چیز چُرائی ہے۔ چلیے ایک نظر سارے کمروں پر ڈال لیں۔"

"چلیے! یہ کام بھی ضروری ہے۔" ظہیر نے کہا اور وکیل صاحب کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ایک ایک کر کے انہوں نے سارے کمرے چھان مارے۔ وکیل صاحب ہر کمرے کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی چیز کم بتاتے اور جب سارے کمرے دیکھ چکے تو سینے پر دوہتڑ مار کر بولے۔ "ہائے ظالموں نے کُچھ بھی تو نہیں چھوڑا۔ میری اِتنی محنت کی کمائی اور یوں ضائع ہو گئی۔"

"خاطر جمع رکھیے۔" ظہیر نے ہمدردی سے کہا۔ "خُدا نے چاہا تو جلدی ہی بدمعاش اپنے کئے کی سزا بھگتیں گے اور اب ذرا مُجھ وہ خط دکھائیے اور ڈاکوؤں نے آپ کو بھیجا تھا۔"

"لیجیے یہ ہے۔" وکیل صاحب کاغذ کا ایک پرزہ دے کر بولے۔ "مگر اس سے آپ کے پلّے کیا پڑے گا؟"

ظہیر نے چٹھی لے کر روشنی کے سامنے غور سے دیکھی۔ میلے سے کاغذ پر پنسل سے چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ "اچھا اب جو جو چیزیں آپ کی چوری ہوئی ہیں، ان کے نام لکھوائیے۔" ظہیر جیب سے کاغذ پنسل نکال کر بولا۔

"ایک چیز ہو تو بتاؤں۔" وکیل صاحب آہ بھر کر بولے۔ "خیر موٹی موٹی چیزیں لکھ لو۔ ایک گھڑی۔ ایک ریڈیو اور۔۔۔"

"اُف۔۔۔!" ظہیر اُنگلی دبا کر بولا۔ "میری انگلی میں تکلیف ہے۔ آپ خود لکھ دیجیے۔ شکریہ۔"

وکیل صاحب نے فہرست مکمل کر کے ظہیر کو دے دی اور ظہیر نے جو اُسے دیکھا تو اُس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اس نے وکیل صاحب کی لکھی ہوئی فہرست کو ڈاکوؤں کے خط سے کئی بار ملایا اور پھر اطمینان سے بولا۔

"وکیل صاحب قبلہ! سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا کہوں؟ آپ میرے بزرگ ہیں۔ اگر کوئی میرا ہم عُمر ہوتا تو اُسے اس شرارت کا مزہ چکھاتا۔ مگر افسوس۔۔۔۔!" "کیا؟ کیا؟" وکیل صاحب کُرسی سے اُٹھ کر بولے۔ "اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ ہے کہ آپ نے میرے ساتھ چار سو بیس کی ہے۔" ظہیر تن کر بولا۔ "ذرا خیال کیجیے۔ یہ اندھیری رات۔ سردی کا موسم۔ میں اتنی دُور سے چل کر آیا۔ آپ کی دل لگی ہوئی اور میرا خواہ مخواہ وقت ضائع ہوا۔ سُنیے حضرت! نہ تو آپ کے گھر میں کوئی چور گھُسا اور نہ ڈاکو۔ یہ سارا کھیل آپ کا من گھڑت ہے اور اس کا مقصد مُجھے احمق بنانا ہے۔ مگر یاد رکھیے میں اِتنا بے وقوف نہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔"

وہ وکیل صاحب کو لے کر کمرے میں پہنچا جہاں وُہ کُرسی پر بندھے پڑے تھے۔ اور کھڑکی کے پاس جا کر بولا۔ ’’آپ کہتے ہیں کہ اس کھڑکی کو توڑ کر ڈاکو اندر گھُسے تھے۔ مگر ایک بچّہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ کھڑکی کو باہر سے توڑا جاتا تو شیشے کے ٹُوٹے ہوئے ٹکڑے کمرے کے اندر ِگرتے۔ لیکن کمرے کے فرش پر شیشے کا ایک ریزہ بھی دِکھائی نہیں دیتا۔ سارے ٹکڑے کھڑکی کے باہر زمین پر پڑے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھڑکی باہر سے نہیں توڑی گئی۔ بلکہ اندر سے توڑی گئی ہے اور پھر کھڑکی باہر کی طرف سے اِتنی اُونچی ہے کہ کوئی شخص بغیر دیوار پر پیر ٹیکے اُوپر نہیں چڑھ سکتا۔ اگر کوئی باہر سے چڑھتا تو دیوار پر یا کھڑکی میں مٹّی کے نشان ضرور ہوتے۔ مگر دیکھیے، یہاں ایسا کوئی بھی نشان دکھائی نہیں دِکھتا۔ آخر میں ایک مزید ار بات اور سُنیے، جس سے آپ کی عیّاری کا بھانڈا پھُوٹ گیا۔ آپ کہتے ہیں یہ چِٹھّی آپ کو ڈاکوؤں نے لکھی تھی۔ مگر اصل میں یہ چِٹھّی خود آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اس چِٹھّی کے خط میں اور اس فہرست کے خط میں جو ابھی ابھی آپ نے لکھی ہے، کیا فرق ہے؟ ان دونوں کی تحریر ایک ہی

شخص کی ہے یعنی آپ کی۔"

یہ سُنتے ہی وکیل صاحب مُسکرانے لگے اور پھر اُونچی آواز میں بولے۔ "کپتان صاحب باہر آجائیں۔ آپ کا بیٹا جیت گیا۔"

ظہیر نے حیرانی سے سٹور کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ابّا جان چلے آ رہے تھے۔

"اب اصل کہانی سنو۔" وکیل صاحب نے کہا۔ "میرا نام احمد خان ہے اور میں پولیس کا سپرنٹنڈنٹ ہوں اور آپ کے والد کا اچھّا دوست ہوں۔ ہم تمہاری ذہانت اور عقل کا امتحان لینا چاہتے تھے۔ یہ گھر ہمارے وکیل دوست کا ہے جو کہ کام کے سلسلے میں یہاں سے دوسرے شہر منتقل ہو گیا۔ یہ گھر کچھ عرصے سے خالی تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس کام کے لیے اس سے اچھی جگہ شاید نہ مل سکے۔ ہم نے اس کی چابی اس کے بیٹے سے کُنجی لے لی اور یہ ناٹک کھیلا۔ مُجھے خُوشی ہے کہ تُم امتحان میں فرسٹ ڈویژن کامیاب ہوئے۔"

"میاں صاحب زادے! خُدا تمھیں بُری نظر سے بچائے۔" سپرنٹنڈنٹ صاحب

نے کہا۔ ”جلدی جلدی تعلیم ختم کر لو۔ پھر میرا ذمّہ ہے کہ تمہیں خفیہ پولیس میں کسی بڑے عُہدے پر نوکر کرادوں گا۔ مجھے اُمّید ہے کہ اپنے ملک و قوم کی خوب خدمت کرو گے۔ تُم جیسا ذہین اور عقل مند لڑکا آج تک میں نے نہیں دیکھا۔“

”اچھّا خیر یہ تو ہوا۔“ کپتان صاحب بولے۔ ”صبح کِسہ بڑھئی کو بُلا کر کھڑکی ٹھیک کرا دینا ورنہ بے چارا وکیل پریشان ہو گا۔ اب آؤ چلیں۔ رات کافی گزر چُکی ہے۔“